



وَالَّذِينَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوتَ أَنْ
يَعْبُدُوهَا وَأَنَابُوا إِلَى اللَّهِ لَهُمُ
الْبُشْرَىٰ ۖ فَبَشِّرْ عِبَادِ ۝ (الزمر: ۱۷)

”اور وہ لوگ جنہوں نے طاغوت کی (عقیدت اور) بندگی
سے اجتناب کیا اور (یکسو ہو کر) اللہ کی طرف رجوع کیا
تو انہی کے لئے خوشخبری ہے، تو (اے نبی) بشارت
دیدو میرے ان بندوں کو۔“

الهامی ادب

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَلَنْ تَرْضَى عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَى
حَتَّى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۖ قُلْ إِنْ هَدَى اللَّهُ
هُوَ الْهُدَى ۖ وَلَئِنْ أَتَبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ
بَعْدَ الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۖ مَا لَكَ
مِنَ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ

(البقرة: ۱۲۰)

”یہودی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے اور نہ نصاریٰ
جب تک کہ تم ان کے دین کی پیروی اختیار نہ کرو۔
(صاف) کہہ دو کہ بیشک اللہ کی ہدایت (یعنی دین اسلام) ہی (اصل)
ہدایت ہے اور (اے نبی!) اگر تم نے اپنے پاس علم (وحی الہی)
آجانے کے بعد بھی ان کی خواہشات کی پیروی کی تو تم کو
اللہ (کی بچہ) سے بچانے والا نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی مددگار“

حدیث دل

اداریہ

اللہ تعالیٰ کی ہمیشہ سے یہ سنت رہی ہے کہ وہ اہل ایمان کے اخلاص کا امتحان لیتا ہے۔ مختلف آزمائشوں کے ذریعہ ان کو ہر طرح کے کھٹ سے پاک کرنے اور اس طرح ان کی تربیت کا انتظام فرماتا ہے تاکہ ان کے اندر اپنے فرائض دینی کے تعلق سے جمیدگی، احساس ذمہ داری، سیرت و کردار میں نکھار اور عزم و ارادے اور ہمت و حوصلے میں مضبوطی پیدا ہو۔ وہ دنیوی طور پر اس بار امانت کو اٹھانے کے اہل ثابت ہو کر اللہ کی تائید و نصرت سے ہمکنار ہوں اور آخرت میں اس کی رضا و خوشنودی اور جنت کی لازوال نعمتوں کے وارث بن سکیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں اہل ایمان کو راستے کی ان مشکلات سے خبردار کر دیا گیا:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ﴿١٥٥﴾

گویا منصوبہ الہی یہ ہے کہ اسلامی عقیدے کے حامل افراد پر بے اخلاص اور یکسوئی کے ساتھ اپنے عقیدے پر قائم ہوں یعنی اس کو عملاً "اختیار کر کے اس کے تقاضوں کو پورا کریں" اس کی حفاظت کرنے اور اس کو دنیا والوں کے اندر پھیلانے میں سرگرم عمل ہوں اور پھر اس راہ میں پیش آنے والے مصائب و آلام اور مشکلات کو انگیز کرتے چلے جائیں یہاں تک کہ جب وہ اپنے عقیدے پر اس طرح استقامت دکھائیں کہ کوئی بڑی سے بڑی آزمائش انہیں اس سے متزلزل نہ کر سکے، کوئی قوت انہیں خوفزدہ نہ کر سکے، وہ شلوک و شہامت پھیلانے والی شیطانی چالوں سے مرعوب یا متاثر نہ ہوں اور اللہ کی راہ میں آزمائشوں اور فتنوں کا سامنا کرتے ہوئے ان سے کسی گزرواری و کم ہمتی کا اظہار نہ ہو تو اللہ کی رحمت متوجہ ہو اور اسکی تائید و نصرت ان کے شامل حال ہو جائے۔ کیونکہ اس وقت وہ اللہ کے دین کے بچے امین ثابت ہو کر اس کی حفاظت و مدافعت کے اہل اور جنت کی صورت میں انجام خیر کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ ان کے دل خوف، زندگی کی حرص و طمع اور راحت طلبی و بیش پسندی سے آزاد اور پاک ہو جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی اسی سنت کے نوازے سے امت مسلمہ کے اولین گروہ (صحابہ کرامؓ) کو بالخصوص اور اس راہ پر چلنے والوں کو بالعموم گذشتہ مومن گروہ ہوں کے تجربات کی طرف متوجہ کیا اور ان پر واضح فرما دیا کہ وہ جس مخصوص گروہ کے ہاتھوں میں اپنے دین کا پرچم تھامتا اور ان پر یہ بار امانت ڈالتا ہے، ان کے اخلاص کے امتحان اور ان کی تربیت کے سلسلے میں اس کی سنت یہی آزمائشوں کی سنت ہے۔ چنانچہ فرمایا:

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُتْلَىٰ الْجَنَّةُ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الْفَنَنِ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۖ مَا سَمِعْتُمْ الْبَاسَ وَالضَّرَاءَ وَوَلَوْ أَحْنَىٰ يَقُولُ الرَّسُولِ وَالْفَنَنِ

أَسْوَأَ مِمَّنِي نَصْرَ الْمَلِئَلَا أَنْ نَصَرَ اللَّهُ قَرِيبَ ﴿٢١٣﴾

یہاں انہی آزمائشوں کے تعلق سے بتایا گیا کہ جب دل ان بلا دینے والے مصائب و شدائد کے مقابلے میں استقامت دکھاتے ہیں تو اللہ کی مدد آجاتی ہے اور یہ کہ اس کی نصرت کے مستحق صرف وہ لوگ ہوتے ہیں جو آخر تک ثابت قدم رہیں، ہو بلا ڈالنے والی مصیبتوں

کے مقابلے میں چٹان ثابت ہوں، جن کے سر طوفانوں کے آگے نہ جھکیں۔ وہ صرف اللہ کی نصرت کے منتظر ہوتے ہیں، کسی اور حل یا کسی اور کی طرف سے آئی ہوئی مدد کے نہیں! اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حوالے سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بتایا جبکہ وہ مکہ میں جو روہم کی چٹکی میں پس رہے تھے کہ ان سے پہلے لوگوں کو اس راہ میں شدید ترین آزمائشوں سے دو چار ہونا پڑا ہے، ان میں سے بعض کو زمین میں گڑھے کھود کر ان کے اندر رکھا کر دیا جاتا اور پھر آرا ان کے سر پر رکھ کر ان کے جسموں کو دو حصوں میں چیر دیا جاتا اور بعض کے جسموں پر فولادی کنگھیاں پھیری جاتیں جس سے ان کا چمڑا گوشت سے اور گوشت ہڈیوں سے علیحدہ ہو جاتا لیکن اس کے باوجود وہ جیتے رہتے اور اللہ کے دین سے پھرنے پر تیار نہ ہوتے تھے۔ (بخاری)

حقیقت یہ ہے کہ اہل ایمان کی تربیت کے لیے یہ امر ناگزیر ہے کہ وہ ابتلا و آزمائش سے گزریں اور اللہ کی راہ میں مختلف تکالیف، بھوک، جان و مال اور پیدوار کے نقصانات کے ذریعہ ان کی ثابت قدمی اور چٹکی کا امتحان ہو۔ مصائب و آلام کی بھی میں چپ کر وہ ہر طرح کی آزمائشوں سے پاک و صاف ہوں۔ یہ ابتلا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اہل ایمان عقیدے کی تکلیف کو برداشت کرنے کے قابل ہو سکیں۔ وہ جس حد تک عقیدے کی راہ میں تکالیف برداشت کریں گے اور اس کی خاطر قربانیاں دیں گے اتنا ہی عقیدہ ان کے دلوں میں راسخ و مستحکم ہوگا اور اس کے ساتھ ان کی محبت و وابستگی میں اضافہ ہوگا۔ اسی لیے مومنین کے حق میں اللہ کا فیصلہ آزمائش کے بعد ہی نازل ہوتا ہے۔ اسی طرح دوسرے لوگوں کو بھی اس کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اسی وقت صحیح احساس و شعور ہوتا ہے جب وہ عقیدے کے حاملین کو اس کے باعث آزمائشوں سے گزرتے اور ان پر ثابت قدم دیکھتے ہیں۔ تب ہی عقیدہ مخالفین کے درمیان بھی غور و فکر اور سنجیدہ بحث کا موضوع بنتا ہے اور وہ اس کی طرف لپکتے لگتے ہیں۔ اس طرح ان کا اعتراف حقیقت بھی اہل ایمان کے لیے نصرت الہی کا خوشگوار اور جانفزا بھونکا ہوتا ہے۔

ایسی آزمائشوں اور جان و مال کے نقصانات کے وقت رجوع الی اللہ کی صورت میں خود سپردگی کا انداز اختیار کرنے والے خوش نصیب ہی وہ صابر و ثابت قدم لوگ ہیں جن کو ان کے مالک کی طرف سے اپنے یہاں مقام بلند کی خوشخبری دی گئی ہے فرمایا تاولنک علیہم صلوات من ربہم ورحمتہ۔ (البقرہ: ۱۷۷) اور حدیث قدسی میں اللہ فرماتا ہے کہ ”میرے پاس اپنے ایسے بندے کے لیے جو دنیا کی محبوب چیزوں کے نقصان پر صبر کرتا ہے، جنت کے علاوہ کوئی بدلہ نہیں“ (بخاری) اسی طرح اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”کسی مسلمان کو کوئی تکلیف و غم، تھکن، بیماری، حزن و ملال یہاں تک کہ کانٹے کی چیمن جیسی تکلیف بھی نہیں پہنچی مگر یہ کہ اللہ اس کے بدلے میں اس کے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے“ یعنی جب وہ ان پر صبر اختیار کرتا ہے۔ (متفق علیہ)

اہل ایمان کو اللہ تعالیٰ اپنی راہ میں صبر و صلوة سے استقامت کی تعلیم فرماتا ہے: یا ایہا الذین امنوا استعینوا بالصبر والصلوة ذان اللہ مع الصابرین ○ (البقرہ: ۱۵۳)۔ یہ راہ پھولوں کی سبز گھاٹیوں اور کانٹوں سے چڑ ہے۔ بڑی طویل اور جا کھل ہے۔ اس میں قدم قدم پر مصائب و پریشانیاں ہیں، مزاحمتیں اور مخالفتیں ہیں اور صبر ہی وہ زاد راہ ہے جو اس سفر میں ہر پریشانی اور مشقت کا مقابلہ کرنے کے لیے ضروری ہے۔ نبی علیہ السلام نے فرمایا: وما اعطی احد عطاء خیرا و اوسع من الصبر کہ ”کسی شخص کو صبر سے بہتر اور وسیع تر کوئی اور بھلائی عطا نہیں کی گئی“ (متفق علیہ)۔ قرآن میں متعدد بار صبر کا ذکر آیا ہے۔ کیونکہ انسانیت کا خالق سب سے بڑھ کر اس حقیقت کا جاننے والا ہے کہ مختلف میلانات اور محرکات کی کشاکش کے درمیان راہ حق پر استقامت کے لیے مسلسل جدوجہد کی ضرورت ہے اسی طرح مصائب و آلام اور دشوار گزار مراحل کے درمیان دعوت الی اللہ کی ذمہ داریوں سے عمدہ برآ ہونا انتہائی صبر آزما اور سخت سعی و عمل کا متقاضی ہے۔ چنانچہ اس کا تقاضا یہ ہے کہ مومن کے اعصاب مضبوط اور اس کے قویٰ مجتمع و محکم ہوں اور وہ اس راہ کے چٹ و غم سے اچھی طرح آگاہ اور ہوشیار ہو۔ ان تمام امور کے سلسلے میں صبر و استقامت درکار ہے اطاعت الہی اور جملہ معصیوں سے اجتناب پر صبر۔ مرغوبات

نفس کی خوشنمائی اور مفادات دنیا کی تحریکوں کے خلاف صبر و دعوت حق کو پھیلانے کے سلسلے میں جہد مسلسل اور اس جہد و جدوجہد کے دوران انسانی نفس میں پیدا ہونے والے رنج و الم، غیظ و غضب اور دل کی تنگی کے مختلف احساسات و تاثرات کے خلاف صبر و حق کے حامیوں کی قلت تعداد اور ان کی کمزوری پر صبر پر خار اور پُر خطر راستے کی طوالت، اس راہ کی تلخیوں اور تنگی کے اوقات میں شیطانی وساوس کے خلاف صبر۔ انسانی فطرت سے امید کی کمی، اکتاہٹ اور ناامیدی کے خلاف صبر اور بعد ازاں حالات کی سازگاری اور فتح و نصرت کے وقت ضبط نفس پر صبر و شکر۔

لیکن جب اعلیٰ کلمتہ اللہ کی جدوجہد زیادہ سے زیادہ پر خار و پر مشقت شکل اختیار کر لے اور اس راہ کی مسافت طویل سے طویل تر ہو جائے، پھر اس کے لیے زاوہ راہ بھی نہ ہو یا اسباب و وساکن کا فقدان نظر آنے لگے تو اس راہ کے راہی کا عزم و صبر ختم ہونے یا کمزور پڑنے لگتا ہے۔ اسی لیے صبر کے ساتھ صلوٰۃ کو جوڑ دیا گیا۔ صلوٰۃ پڑھنے اور رب کے درمیان ربط و تعلق کا نام ہے، ایسا ربط تعلق جس سے دل کو قوت حاصل ہوتی ہے۔ دراصل صلوٰۃ وہ چشمہ ہے جو کبھی خشک نہیں ہوتا اور اس سے اہل ایمان کو وہ زاوہ راہ ملتا ہے جو دنیا کے تمام وساکن سے زیادہ قیمتی ہے اور وہ چشمہ حیات ہے جس سے ناناواں کو از سر نو طاقت ملتی ہے اور صبر کی رسی ایسی مضبوط و دراز ہوتی ہے کہ ٹوٹنے نہیں پاتی۔ یہی نہیں، صلوٰۃ کے ذریعہ مومن کو صبر کے علاوہ بشارت، طمانیت اور یقین و اعتماد کی نعمتیں حاصل ہوتی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی پریشانی لاحق ہوتی، نامساعد حالات پیش آتے تو آپ صلوٰۃ کی طرف رغبت فرماتے۔ آپ کو تربیت دی گئی تھی..... والی رنک لوب۔ حالانکہ اللہ سے آپ کا تعلق بہت ہلکا اور لم ہنوز لزل تھا۔ اس لیے ایک ناپائیدار کمزور اور محدود قوت کے حامل انسان کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ عظیم ترین قوت (اللہ عزوجل) سے ربط و تعلق قائم کرے اور جب دعوت حق کے لیے جدوجہد اور مشقت اس کی محدود قوت سے تجاوز ہونے لگے تو وہ اس سے مدد حاصل کرنے میں لگ جائے۔ یہ استعانت اس وقت اور بھی ضروری ہوتی ہے جب مومن کو شرکی کھلی اور چھپی تمام قوتوں سے محروم آنا ہونا پڑتا ہے۔ جب خواہشات کی تحریک اور مفادات کی طمع کے درمیان راہ حق پر استقامت کی جدوجہد اس کے لیے ایک بوجھل کام بن جاتا ہے، جب وہ دیکھتا ہے کہ شر پھل پھول رہا ہے اور خیر اس کے مقابلے میں لاچار و ناتواں ہے، جب افق پر روشنی کی کوئی کرن اور کوئی نشان راہ نظر نہیں آتا۔ یہ سرچشمہ حیات آج بھی ہر اس مومن کی دسترس میں ہے جسے راہ حق کے لیے توشہ و رکار ہو، جو وہ پہر کی شدید گرمی میں سیرابی کا طالب ہو، ہر طرف سے مدد کے مسدود ہونے پر مدد کا طلبگار ہو اور جسے مسلمان سفر ختم ہو جانے کے بعد زاوہ راہ کی ضرورت ہو۔ فی الحقیقت اللہ سے ملاقات اور تمام معاملات میں اس کی طرف رجوع کے یقین ہی پر صبر و استقامت کا دار و مدار ہے۔ جب ان اقدار کے سلسلے میں انسان کی میزان درست ہو جائے تو پوری دنیا اسے شمن، قلیل اور متاع حقیر نظر آتی ہے اور آخرت اپنی حقیقی صورت میں اس کے سامنے نمایاں ہوتی ہے۔

آج بھی کتاب و سنت کی یہ تعلیمات اہل ایمان ساتھیوں کے لیے صبر و استقامت اور دلچسپی کا سامان ہیں۔ اس راہ کی دشواریاں ہم جیسے کمزوروں کے لیے یقیناً بہت ہی کٹھن ہیں تاہم انکا سامنا اس راہ کے مسافروں کے لیے ناگزیر ہے۔ نبی علیہ السلام کی حدیث ہے کہ تم دشمن سے ملاقات یعنی اس سے مقابلے کی تمنا نہ کرو لیکن اگر اس سے بڑھ بھڑ ہو جائے تو صبر کرو اور یاد رکھو کہ جنت تمہاروں کے سامنے ہے، اس کے مطابق ہم آزمائش کی تمنا تو نہیں کرتے لیکن اگر اللہ کی راہ میں کوئی آزمائش آجائے تو پھر اسی پر توکل و بھروسے کے ساتھ، اسی سے اجر کی امید رکھتے ہوئے اس پر صبر کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے قوی امید ہے کہ وہ ہم پر ہماری طاقت سے زیادہ آزمائش نہیں ڈالے گا۔ اس کی بارگاہ عظیم میں دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنی راہ میں صبر و استقامت سے نوازے۔ آمین!

أَنْ لَا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ

سکیم احمد صدیقی

اللہ تعالیٰ نے جن وانس کو صرف اور صرف اپنی ہی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے، چنانچہ فرمایا:۔

...وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۝ (الذاریات: ۵۶)

ترجمہ: ”میں نے جن وانس کو مگر اس لیے کہ وہ میری بندگی کریں۔“

سورۃ البقرۃ میں انسان کی تخلیق اور اپنے احسانات کا ذکر فرمانے کے بعد اس سے ایک ہی مطالبہ فرمایا یعنی

...فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ أُنْدَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ..... (البقرۃ: ۲۲)

ترجمہ: ”پس تم (مخلوق کو) اللہ کا ہمسرہ نہ بناؤ جبکہ تم (اس بات کو) جانتے ہو۔“

ان آیات کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان رب ذوالجلال کی بندگی اس طرح کرے کہ صرف اسی کو اپنا خالق، مالک و رازق، پالنا، مشکل کشا، حاجت روا، داتا، و گھیر، غوث، بگڑی بنانے والا، مرادیں پوری کرنے والا، مصیبت ڈالتے اور نالتے والا اور اولاد دینے والا، غرضیکہ ہر قسم کے نفع و نقصان کا مالک و مختار سمجھے اور اس کا پختہ ایمان و عقیدہ یہ ہو کہ کوئی اور مخلوق، خواہ کوئی نبی ہو یا کوئی ولی، کوئی بھی جائیداد یا بے جان اس کی ذات و صفات اور حقوق و اختیارات میں اس کا سا بھی و شریک نہیں اور نہ ہی کسی کے پاس کسی بھی قسم کے مافوق الاسباب تصرف کا یعنی بنانے، بگاڑنے، دینے، چھین لینے کا کوئی اختیار ہے، بلکہ سب ہی اس کی مخلوق ہیں اور ہر طرح اس کے محتاج ہیں، اس کے حکم و فیصلہ کے آگے بے بس ہیں، سب اسی کے در کے سوا ہی ہیں۔ سورۃ التین اور سورۃ الدھر میں اس بات کو بھی واضح کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو احسن تقویم پر خلق فرمایا، اور کیونکہ بندگی میں اس کا امتحان مقصود ہے اس لیے اس کو عقل و دانش سے نوازا۔ چنانچہ انسان پر لازم ہے کہ پوری طرح غور و فکر اور شعور کے ساتھ اپنے رب کو، اس کی عظمت و کبریائی اور حکمت و دانائی کو پہچانے اور اس کے منصوبہ امتحان کو سمجھے اور سوچ سمجھ کر بندگی کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کی کوشش کرے کیونکہ اسی پر اس کی اخروی فلاح کا دار و مدار ہے۔ امتحانی منصوبہ کے تحت فکر و عمل کی آزادی ضروری ہے چنانچہ یہ بھی واضح کر دیا گیا:۔

... اِنَّ اَهْلَ بَيْتِہٖ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرٌ ۙ اَوْ اَمَّا كَفُوْرٌ ۙ ۝ (الدھر: ۳)

ترجمہ: ”ہم نے اسے راستہ دکھایا، اب خواہ وہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا۔“

اس ربانی منصوبہ امتحان کے تحت اذی و دشمن شیطان لعین کو اس بات کی پھوٹ و مصلحت دی گئی ہے کہ وہ انسان کو صراط مستقیم سے ہٹانے کی بندگی کرانے اور اس کے ایمان و عقیدے کو مشرکان و فاسد عقائد و تہمت سے آلودہ کرنے کی کوشش کرے۔ اس کے یہ

معنی ہرگز نہیں کہ رب العالمین نے جن وانس کو شیاطین کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جامع منصوبے کے تحت جن وانس کے ایمان کی حفاظت کا پورا اہتمام فرما دیا ہے۔ ایک طرف تو عہد الست کے ذریعہ فطرت انسانی کو الہ واحد کی بندگی کے سانچہ میں ڈھالا گیا پھر اس کی یاد دہانی اور حفاظت کے لیے انبیاء علیہم السلام کی بعثت باری رہی۔ اس طرح مضبوط قلعہ بندی کر دی گئی۔ اب جو اپنے آپ کو حفاظت حصار میں محصور رکھیں وہ شیطانی دسترس سے محفوظ رہیں۔ ان کے اوپر شیطان کا وار بھی کارگر نہ ہو۔ اس کے برعکس جو اللہ کی حفاظت سے کترائیں اور اپنے دشمن شیطان ہی کے ہاتھ میں کھیلنا پسند کریں تو ان کو اختیار ہے کہ وہ اللہ کی حفاظت سے محروم ہو کر شیطان کا آلہ کار بن جائیں اور اسی کے مشن و منصوبہ کی تکمیل کے لیے اپنی زندگی لگا دیں۔

اس بد نصیب انسان کی ستم خیزی اور جبر و ستم دیکھئے کہ اس نے اپنے شفیق و کریم رب کے احسانات و انعامات کا کیسا کفران کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اشرف المخلوقات بنایا، پاک و طیب رزق عطا فرمایا اور بخور میں مخلوقات پر تسخیری قوتوں سے نوازا اور سب سے بڑھ کر انعام یہ کہ ذہن رسا عطا فرمایا تاکہ وہ آفاق و انفس کے مشاہدہ سے اور اس کی قدرت کی نشانیوں سے اپنے عظیم رب کو پہچان لے اور اس کے ساتھ صحیح معنوں میں بندگی کا رشتہ قائم کر لے۔ کیا انسان نہیں جانتا کہ اس کائنات کا خالق و مدبر کون ہے، کس نے آسمان قائم کیا ہے، زمین کو پھیلایا ہے، کون ہوائیں چلاتا ہے، بارش برساتا ہے اور اس کے ذریعہ زمین سے ضروری اجناس اگاتا ہے، کس نے اسے مخلوق نافذ سے پیدا کر کے وجود بخشا قیمتی اعضاء کے ساتھ بہترین دیکر عطا فرمایا، سامان زیست بہم پہنچایا۔ ماں باپ کے اندر محبت کے جذبات پیدا کر کے کس نے اس کی اور تمام مخلوقات کی پرورش کا انتظام فرمایا۔ الغرض کیا انسان کو ضیاع معلوم کہ اس وسیع و عریض کائنات اور اس کے نظام کا خالق و مدبر کون ہے! انسان نے جن ہستیوں کے ساتھ بندگی کے تعلقات پیدا کر لئے ہیں، ان کو اللہ کے صفاتی نام بھی دے دیے ہیں اور ان کے بارے میں تصرف فی الامور کا عقیدہ بھی اپنایا ہے کیا وہ سب مل کر اللہ کے ”تخلیق و تدبیر امر“ کے درج بالا کاموں میں سے کوئی کام بھی کر سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ پھر ان ہستیوں کے ساتھ انسان کے بندگی کے تعلق کا کیا جواز ہے اس طرز عمل کی کیا بنیاد ہے؟ کتاب اللہ میں اس اہم مسئلہ کو مختلف انداز میں اجاگر کیا گیا ہے۔ انبیاء علیہم السلام نے اپنی مدعو اور مخاطب قوم کو ایسے جامع اور ناقابل تردید آفاق و انفس کے دلائل سے مجھوڑا، لیکن نہ تو قدیم ”مسلمان مشرک“ کے پاس اس کا جواب تھا اور نہ جدید ”مسلمان مشرک“ کے پاس اس کا کوئی جواب ہے۔ مقام حیرت ہے کہ زمان و مکان کے بے پایاں طویل فاصلوں کے باوجود ان کا نظریہ الوہیت یکساں ہے اور مشرکانہ انداز بندگی میں کوئی خاص فرق نہیں۔ کوئی ہاتھ سے تراشے ہوئے کھڑے اور بیٹھے ہوئے کو نبی ولی تصور کر کے ان کو داتا، غوث اور خلیفہ بخش بنائے ہوئے پوج رہا ہے، تو کوئی مردہ اور گلے سڑے مٹی میں دبے بے جان لاشوں کو رب کائنات کا قائم مقام بنا کر جموں لیاں بھرنے والا، قسمت بنانے والا، مشکل کشا اور حاجت روا بنائے ہوئے پوج رہا ہے، بدو کے لیے پکا رہا ہے، ان پر جڑھاوے ہیں، عقیدت کے پھول اور چادریں ہیں، شکر گزاری کے لیے ان کے مخصوص دنوں میں نذر و نیاز ہے۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی حیرت انگیز ترقی اور خلائی تسخیر و تحقیق کے باوجود قدیم و جدید انسان، مفکر و دانشور، فلسفی و مفسر کے انداز فکر میں کوئی نمایاں تبدیلی رونما نہ ہوئی۔ مادی ارتقاء کے انقلابی ادوار انسان کے فکری ڈھانچے پر قطعاً ”اثر انداز نہ ہو سکے۔“ تو ہم پرستی اور کواکب پرستی میں پانچ ہزار سال قبل دور ابراہیمی کا مشرک اور آج کا مشرک ایک ہی سے انداز فکر کا حامل ہے اور ان بتاؤنی مجبوروں کے ساتھ دونوں کا طرز عمل یکساں ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ دراصل الہ واحد کی بندگی کے مین فطری راستہ سے بھٹک کر انسان اپنے ازلی دشمن شیطان کی گود میں جا گرتا ہے، جہاں شیطان اور اس کے ہمراہوں کے پھیلائے ہوئے دام قریب کا شکار ہوتا ہے، ”مشرک و اوہام پرستی کے جال میں اس بری طرح پھنس جاتا ہے کہ قلب و ذہن پر قفل پڑ جاتا ہے، عقل سلیم ناکارہ ہو جاتی ہے، غور و فکر کے دروازے بند ہو جاتے ہیں پھر دشمن دین حق اس کی تقلید اعمیٰ کے نرم و گداز بستر چھکیاں دے کر سلاوتا ہے، اور ”ورضوا بالحبوة الدنیا و اطعموا نولہا“ (سورہ بقرہ: ۱۷۰) کا مصداق بن جاتا ہے جس

کا مضمون ہے کہ یہ لوگ اپنی عیش و طرب کی زندگی پر راضی اور (توہم پرستی کی) دینی روش پر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ پھر ایک طرف تو نوری سالوں کے فاصلوں کی مسافت پر کواکب و نجوم انسانی قسمت پر اثر انداز ہونے لگتے ہیں تو دوسری طرف تعویذ، تہذیب، کڑے پھلے، دھاکے، تاجے، انگوٹھی، گھینے اور پتھر اس کو نفع و نقصان پہنچانے لگتے ہیں۔ اور یہ اوہام پرست انسان اس عقیدے کو اپنا لیتا ہے کہ سیاہ و سرخ اور زعفرانی تحریریں، نقش و نگار، جادوئی مرہے، ایجد ہونے... پر مبنی علم الاعداد کے کرشمے، ٹوٹے و ٹوٹکے پیاری سے شفاء دے سکتے ہیں، بگڑی بنا سکتے ہیں! ع! کیا بھٹک گیا انسان۔ تف ہے اس ذی شعور انسان پر، عالم اسباب میں رہنے والا، مادی وسائل اور تخیری قوتوں اور بے شمار صلاحیتوں سے مالا مال انسان قرآن و حدیث سے بے بہرہ ہو کر راہ ہدایت سے بھٹکا اور توہمات کے گڑھے میں جا کر۔ حیف صد حیف! اللہ تعالیٰ نے اس کو اشرف المخلوقات بنا کر عز و شرف عطا فرمایا اور اس نے شکر گزاری کے بجائے کفران نعمت کی روش اپنا کر ہدایت و رہنمائی سے محروم کر کے اپنے آپ کو اسل سلطین بنا ڈالا اور قمر مذلت کا مستحق ٹھہرا لیا۔ یہ تو بڑھا لکھا ہو کر بھی جاہل بن گیا۔ بظاہر تو یہ بات کچھ عجیب معلوم ہوتی ہے لیکن یہ یہ حقیقت کہ پڑھے لکھے ہی شیطان کے کام آتے ہیں اور بے پڑھے لکھے ”کالانعام“ تو ان کے پیچھے ہی چلتے رہتے ہیں الاما شاء اللہ۔ ان پڑھے لکھوں سے شیطان یہ کام لیتا ہے کہ کتاب اللہ کی آیات کے کتمان اور تحریف کے ذریعہ لوگوں کو گمراہ کریں، ”وحدت الوجود“ قسم کے نظریات پھیلا کر عبد و معبود کے امتیازی فرق کو ختم کریں، ”عود روح“ کے عقیدے کو لا کر مردوں کو زندہ کریں، ”انہیں متصرف فی الامور بنائیں“ کشف قبور کا عقیدہ ایجاد کر کے تصوف و طریقت کی راہ کھولیں اور قبوری دین کی بنیادیں استوار کریں تاکہ اللہ واحد کی بندگی کے دین پر صوفیوں، بت پرستوں اور قبر پرستوں کا مکمل غلبہ و تسلط ہو جائے، الامان الحفیظ!! اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے ایماندار بندوں کو ان ”پڑھے لکھوں“ سے ہوشیار فرمادیا تھا۔

”اے مومنو! بے شک ان مولویوں اور پیروں کی اکثریت (کا حال یہ ہے کہ وہ) لوگوں کا مال باطل طریقے سے

کھاتے اور ان کو اللہ کے راستے سے روکتے ہیں۔“ (التوبہ ۳۴)

اللہ کی نظر میں علم والے تو وہی ہیں جو خوف آخرت اور خشیت الہی کے حامل ہوں، چنانچہ فرمایا۔

... انما یخشى الله من عباده العلماء... (الفطرۃ ۲۸)

ترجمہ : ”اللہ کے بندوں میں صرف علم والے ہی اللہ سے ڈرتے ہیں۔“

یعنی صحیح معنوں میں علم والے وہ سلیم الفطرت لوگ ہیں جو ایمان کے مسئلہ کو پورے شعور کے ساتھ سمجھ کر دعوت کو قبول کریں اور پھر اپنے اندر خشیت الہی، تقویٰ، صبر، حلم و اناة کے اوصاف کی نشوونما کریں یہ آخرت پر نظر رکھنے والے ”اولوالالباب“ ہیں۔ ان کا عالم یہ ہوتا ہے کہ جب بھی سچی بات ٹھوس دلیل کے ساتھ ان کے سامنے آتی ہے، غور و فکر کے بعد اس کو قبول کر لیتے ہیں، یہ انانیت پرست و ہمت و حرم نہیں ہوتے کہ باطل روش پر اڑے رہیں اور جھوٹ کو بھی محض لغائی سے سچ ثابت کرنے کی کوشش کریں۔ حقیقی مومنوں میں جاہل و عالم میں یہی امتیازی فرق ہے جس کو کتاب اللہ میں صراحت کے ساتھ واضح کر دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ پڑھے لکھے ہونے سے بھی جمالت کی روش اختیار کرنے والے، دعوت حق سے روگردانی کرنے والے نہ صرف جاہل بلکہ ”انہی“ (اندھے) ہیں۔ ان امور اور ذریعہ اصول کی جامع تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورہ رعد آیات ۱۹ تا ۲۴۔

الغرض قدیم و جدید جملہ خواہ وہ جاہل مطلق ہوں یا نام نہاد ”پڑھے لکھے جاہل“ اوہام پرستی کے مرض خبیث میں یکساں طور سے مبتلا ہوتے ہیں۔ مثلاً ”آج بھی مرد و خواتین تہذیب و عقیدت کے جذبہ کے ساتھ گھینوں، پتھروں اور نقش والی انگوٹھیاں پہنے نظر آتے ہیں۔ بعض پتھریا گھینے کے جسم سے مس ہونے کو موثر مانتے اور کبھی کسی پتھر کو شخص سمجھ کر تبدیل کر دیتے ہیں۔ توجہ دلانے پر بعض افراد یہ کہہ کر جان چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ تو محض شوق پورا کرنے اور حسن و وقار کے لیے ہے، عقیدہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ممکن ہے کسی

حد تک ان میں سے بعض کی توجہ درست ہو لیکن اس حقیقت کو کون بھٹائے گا کہ یہاں یہ رعب و زہنت اور زیورات کے ذریعہ آرائش تو صرف اور صرف خواتین کے لیے مخصوص ہے اور وہ انگوٹھی، چھلے اور دیگر زیورات اس مقصد کے لیے استعمال کرنے میں حق بجانب ہیں۔ لیکن خواتین بھی تگینے، پتھر اور نقش والی انگوٹھیاں جذبہ عقیدت اور خیرورکت یا نفع و نقصان کی تاثیر کے عقیدہ کے ساتھ استعمال کریں تو یہ مشرکانہ فعل ہوگا۔ اور جہاں تک مردوں کا تعلق ہے تو ان کے لیے اس قسم کی آرائش یہاں دنیا میں ممنوع ہے البتہ جنت میں ان کو بیش بہا زیورات پہنائے جائیں گے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یہ پیشہ ور دیندار اور نام نہاد علماء و پیر اپنے ایجاد کردہ اوبام پرستی پر مبنی مشرکانہ افعال کے لیے جواز فراہم کرنے کی کوشش میں کتاب اللہ کی آیات کی من مانی تاویل سے بھی گریز نہیں کرتے۔ پتھروں اور نگینوں کے تقدس کے لیے قرآن سے دلیل لاتے ہیں کہ، ”یکھ اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر سورہ رحن میں فرمایا ہے پھر حمران کی افادیت سے کیسے انکار کر سکتے ہو۔ یہ ایک فریب کارانہ انداز ہے کہ آیات قرآنی کو سیاق و سباق سے ہٹا کر اپنے معنی و منہوم کا لباس پہنا کر باطل مقصد کے لیے بے عمل استعمال کیا جائے۔ سورہ رحن کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے صالحین کے لیے جن انعامات کا ذکر فرمایا ہے ان میں نیچی نگاہ والی (باحیا و حسین) خواتین کا بھی ذکر ہے جن کو (حسن و لطافت کے لحاظ سے) یا قوت و مرجان (انمول بیروں اور بچے موتیوں) سے تشبیہ دی گئی ہے چنانچہ فرمایا:

كَانَھُنَّ الْیَاقُوتَ وَالْمَرْجَانُ... (الرحمن: ۵۸)

یعنی وہ (عورتیں) ایسی حسین و جمیل ہیں گویا کہ یا قوت و مرجان ہوں۔ ظاہر ہے کہ یا قوت و مرجان کا ذکر یہاں پتھروں اور موتیوں کی نفع و نقصان کی تاثیر و افادیت ثابت کرنے کے لیے نہیں بلکہ حسن و جمال و رکشش کی وجہ سے اور ان کے نادر انمول ہونے کی وجہ سے تشبیہ کیا گیا ہے۔ اگر پتھروں اور موتیوں میں منفعت اور خیرورکت کی تاثیر ہوتی تو زبان نبوت ضرور اس کو ظاہر فرماتی اور صحابہ کرام جو بے حد خیر کے حریص تھے بڑے ذوق و شوق سے تگینے والی انگوٹھیوں کا استعمال کرتے اور اپنے تابعین کو بھی اس کی تلقین فرماتے لیکن خیر القرون سے ہمیں اس کا ذرا بھی ثبوت نہیں ملتا کہ سلف صالحین پتھروں اور نگینوں کڑوں اور چھلوں وغیرہ کے سعد و نحس ہونے اور کاروبار و معاملات میں خیرورکت یا بیماری میں شفاء کی تاثیر کا عقیدہ رکھتے ہوں۔ اس کے برعکس بخاری کی روایت کے مطابق عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے خطاب بن الارت رضی اللہ عنہ کو سونے کی انگوٹھی پہنے دیکھا فرمایا ”یا ابھی تک اسے اتارنے کا وقت نہیں آیا“ تو خطاب نے فوراً اپنی انگوٹھی اتار دی۔ الغرض یہ عقیدہ کی خرابی اوبام پرستی اور بے جان چیزوں میں خیرورکت اور منفعت و مغفرت کی تاثیر کا تصور نبی علیہ السلام اور دور صحابہ کے صدیوں بعد کی ایجاد ہے ”صوفیوں اور ان کے ہمنواؤں نے ہی اسے پروان چڑھایا اور اب تو یہ ایک وسیع کاروبار کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ پتھروں کے یہ بیوپاری لوگوں کو کس کس انداز سے فریب دیتے ہیں اس کی ایک بھلک ملاحظہ ہو۔ لوگوں کے جذبہ عقیدت کو ابھارنے کے لیے ان کو بتایا جاتا ہے کہ یہ پتھر اور تگینے ایران و عراق کے مقامات مقدسہ کو مس کئے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے ان کی تاثیر دو چند ہو گئی ہے۔ ملاحظہ ہو کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تو قبروں کو بچتے بنائے، اس پر عمارت، گنبد وغیرہ بنائے اور وہاں مجاور بن کر بیٹھنے سے منع فرمایا ہے (مسلم۔ من جازہ) تو پھر ایسے مقامات جہاں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی صریح خلاف ورزیاں ہوں وہ مقامات مقدس کیسے ہو گئے۔ جن قبروں یا مزاروں کو انظار عقیدت، مرادیں مانگنے، بگڑی بنانے حاجت روائی اور فریاد رسی کے مراکز بنایا جائے اور آراستہ کیا جائے، جہاں جبین سائی اور سجدہ ریزی ہو، یہ قبریں اور مقبرے توبت بن جاتے ہیں اور ایسا کرنے والوں پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے (بخاری۔ من مانکھ) ایسے مقامات کو مقدس قرار دینا تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین کا مذاق اڑانا بلکہ منہ چڑانا ہے ”الامان المخطا“ تو یہ ہے حقیقت اس مشرکانہ پتھر و تگینے کے کاروبار کی۔

اکثر و بیشتر علم الاعداد کے تحت تاریخ پیدائش اور زائچہ کے ذریعہ کسی پتھریا نقش کا بھی انتخاب کیا جاتا ہے کہ کون سا پتھر سعد ہے

خوشحالی و برکت کا سبب ہے اور کون سا شخص و بد حالی کا باعث۔ قرآن و حدیث سے دوری نے لوگوں کو راہ ہدایت سے کیسا بھٹکا دیا ہے!۔ یہ بھول گئے کہ خیر و شر کا خالق و مالک صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہے اس نے نہ کلی اختیار کسی کو دیا ہے اور نہ جزوی۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ بعض گمراہ لوگوں نے علم جفر اور علم الاعداد وغیرہ کا موجد امام جعفر صادق کو اور بعض نے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو ٹھہرایا ہے!۔ یہ ایسی ہی بات ہے کہ صوفی اپنے دین طریقت کی ابتداء علی رضی اللہ عنہ سے کرتے ہیں!۔ یہ محض اتمام ہے جو اپنے باطل موقف کے دفاع کے لیے ان اللہ کے ٹیک بندوں پر لگایا گیا ہے۔ اللہ کے ولی و ایماندار و متقی و پرہیزگار ہوتے ہیں (سورہ بقرہ: ۱۷۷) وہ صراط مستقیم ہی پر گامزن رہتے ہیں اور شیطانی پگڈنڈیوں سے ہمیشہ دور رہتے ہیں۔ محققین کے مطابق قدیم زمانہ کی آریائی، طبرانی، یونانی اور مصری قوموں میں ان سفلی علوم و عملیات کا بہت رواج تھا بعض کے نزدیک ان علوم کے موجد اہل بابل تھے علم نجوم کی طرح علم الاعداد کا انحصار بھی سماوی اثرات کے نظریے پر ہے۔ علم الاعداد کی ترقی جو ریاضیات و سائنس کی طرح صنعت و ٹیکنالوجی میں معاون ہو قابل قبول بلکہ قابل ستائش ہے لیکن اگر اس کو محض ٹونے ٹونگے اور توہماتی و سفلی عملیات کی شکل میں قرآن و حدیث پر مسلط کر دیا جائے تو وہ انتہائی قابل مذمت اور قابل نفرت ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ لوگوں کی دین سے بے پرواہی، لاعلمی اور قرآن و حدیث سے دوری سے فائدہ اٹھا کر یہ علمائے سوء و بداری کے روپ میں دوکانداری چیکانے والے جن کی ظاہر اور بنداری اور علیت سے لوگ مرعوب ہو جاتے ہیں، لغاعی اور منطقی انداز سے لوگوں کو دام فریب میں پھانس لیتے ہیں اور علم الاعداد کے گورکھ و حندے میں الجھا کر قرآن و حدیث سے بے نیاز کر دیتے ہیں۔ اب اس کا بھی ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔ عربی کے حروف حقیقی کو آٹھ الفاظ میں تقسیم کیا گیا ہے جو درج ذیل ہیں۔

ایجد۔ ہوز۔ حطی۔ کلمن۔ سعقص۔ قزشت۔ ثخذ۔ ضظغ
ان الفاظ کے حروف کو ایک سے لے کر ایک ہزار تک کے اعداد و مندرجہ ذیل سلسلہ وار لکھنے کے تحت دئے گئے ہیں۔

ا (۱)۔ ب (۲)۔ ج (۳)۔ د (۴)۔ ه (۵)۔ و (۶)۔ ز (۷)۔ ح (۸)۔ ط (۹)۔ ک (۱۰)۔ ل (۱۱)۔ م (۱۲)۔ ن (۱۳)۔ ی (۱۴)۔ ر (۱۵)۔ ش (۱۶)۔ ت (۱۷)۔ ث (۱۸)۔ ع (۱۹)۔ ف (۲۰)۔ ق (۲۱)۔ ک (۲۲)۔ گ (۲۳)۔ خ (۲۴)۔ د (۲۵)۔ ذ (۲۶)۔ ر (۲۷)۔ ز (۲۸)۔ س (۲۹)۔ ص (۳۰)۔ ی (۳۱)۔ ع (۳۲)۔ ف (۳۳)۔ ق (۳۴)۔ ک (۳۵)۔ گ (۳۶)۔ خ (۳۷)۔ د (۳۸)۔ ذ (۳۹)۔ ر (۴۰)۔ ز (۴۱)۔ س (۴۲)۔ ص (۴۳)۔ ی (۴۴)۔ ع (۴۵)۔ ف (۴۶)۔ ق (۴۷)۔ ک (۴۸)۔ گ (۴۹)۔ خ (۵۰)۔ د (۵۱)۔ ذ (۵۲)۔ ر (۵۳)۔ ز (۵۴)۔ س (۵۵)۔ ص (۵۶)۔ ی (۵۷)۔ ع (۵۸)۔ ف (۵۹)۔ ق (۶۰)۔ ک (۶۱)۔ گ (۶۲)۔ خ (۶۳)۔ د (۶۴)۔ ذ (۶۵)۔ ر (۶۶)۔ ز (۶۷)۔ س (۶۸)۔ ص (۶۹)۔ ی (۷۰)۔ ع (۷۱)۔ ف (۷۲)۔ ق (۷۳)۔ ک (۷۴)۔ گ (۷۵)۔ خ (۷۶)۔ د (۷۷)۔ ذ (۷۸)۔ ر (۷۹)۔ ز (۸۰)۔ س (۸۱)۔ ص (۸۲)۔ ی (۸۳)۔ ع (۸۴)۔ ف (۸۵)۔ ق (۸۶)۔ ک (۸۷)۔ گ (۸۸)۔ خ (۸۹)۔ د (۹۰)۔ ذ (۹۱)۔ ر (۹۲)۔ ز (۹۳)۔ س (۹۴)۔ ص (۹۵)۔ ی (۹۶)۔ ع (۹۷)۔ ف (۹۸)۔ ق (۹۹)۔ ک (۱۰۰)۔ گ (۱۰۱)۔ خ (۱۰۲)۔ د (۱۰۳)۔ ذ (۱۰۴)۔ ر (۱۰۵)۔ ز (۱۰۶)۔ س (۱۰۷)۔ ص (۱۰۸)۔ ی (۱۰۹)۔ ع (۱۱۰)۔ ف (۱۱۱)۔ ق (۱۱۲)۔ ک (۱۱۳)۔ گ (۱۱۴)۔ خ (۱۱۵)۔ د (۱۱۶)۔ ذ (۱۱۷)۔ ر (۱۱۸)۔ ز (۱۱۹)۔ س (۱۲۰)۔ ص (۱۲۱)۔ ی (۱۲۲)۔ ع (۱۲۳)۔ ف (۱۲۴)۔ ق (۱۲۵)۔ ک (۱۲۶)۔ گ (۱۲۷)۔ خ (۱۲۸)۔ د (۱۲۹)۔ ذ (۱۳۰)۔ ر (۱۳۱)۔ ز (۱۳۲)۔ س (۱۳۳)۔ ص (۱۳۴)۔ ی (۱۳۵)۔ ع (۱۳۶)۔ ف (۱۳۷)۔ ق (۱۳۸)۔ ک (۱۳۹)۔ گ (۱۴۰)۔ خ (۱۴۱)۔ د (۱۴۲)۔ ذ (۱۴۳)۔ ر (۱۴۴)۔ ز (۱۴۵)۔ س (۱۴۶)۔ ص (۱۴۷)۔ ی (۱۴۸)۔ ع (۱۴۹)۔ ف (۱۵۰)۔ ق (۱۵۱)۔ ک (۱۵۲)۔ گ (۱۵۳)۔ خ (۱۵۴)۔ د (۱۵۵)۔ ذ (۱۵۶)۔ ر (۱۵۷)۔ ز (۱۵۸)۔ س (۱۵۹)۔ ص (۱۶۰)۔ ی (۱۶۱)۔ ع (۱۶۲)۔ ف (۱۶۳)۔ ق (۱۶۴)۔ ک (۱۶۵)۔ گ (۱۶۶)۔ خ (۱۶۷)۔ د (۱۶۸)۔ ذ (۱۶۹)۔ ر (۱۷۰)۔ ز (۱۷۱)۔ س (۱۷۲)۔ ص (۱۷۳)۔ ی (۱۷۴)۔ ع (۱۷۵)۔ ف (۱۷۶)۔ ق (۱۷۷)۔ ک (۱۷۸)۔ گ (۱۷۹)۔ خ (۱۸۰)۔ د (۱۸۱)۔ ذ (۱۸۲)۔ ر (۱۸۳)۔ ز (۱۸۴)۔ س (۱۸۵)۔ ص (۱۸۶)۔ ی (۱۸۷)۔ ع (۱۸۸)۔ ف (۱۸۹)۔ ق (۱۹۰)۔ ک (۱۹۱)۔ گ (۱۹۲)۔ خ (۱۹۳)۔ د (۱۹۴)۔ ذ (۱۹۵)۔ ر (۱۹۶)۔ ز (۱۹۷)۔ س (۱۹۸)۔ ص (۱۹۹)۔ ی (۲۰۰)۔ ع (۲۰۱)۔ ف (۲۰۲)۔ ق (۲۰۳)۔ ک (۲۰۴)۔ گ (۲۰۵)۔ خ (۲۰۶)۔ د (۲۰۷)۔ ذ (۲۰۸)۔ ر (۲۰۹)۔ ز (۲۱۰)۔ س (۲۱۱)۔ ص (۲۱۲)۔ ی (۲۱۳)۔ ع (۲۱۴)۔ ف (۲۱۵)۔ ق (۲۱۶)۔ ک (۲۱۷)۔ گ (۲۱۸)۔ خ (۲۱۹)۔ د (۲۲۰)۔ ذ (۲۲۱)۔ ر (۲۲۲)۔ ز (۲۲۳)۔ س (۲۲۴)۔ ص (۲۲۵)۔ ی (۲۲۶)۔ ع (۲۲۷)۔ ف (۲۲۸)۔ ق (۲۲۹)۔ ک (۲۳۰)۔ گ (۲۳۱)۔ خ (۲۳۲)۔ د (۲۳۳)۔ ذ (۲۳۴)۔ ر (۲۳۵)۔ ز (۲۳۶)۔ س (۲۳۷)۔ ص (۲۳۸)۔ ی (۲۳۹)۔ ع (۲۴۰)۔ ف (۲۴۱)۔ ق (۲۴۲)۔ ک (۲۴۳)۔ گ (۲۴۴)۔ خ (۲۴۵)۔ د (۲۴۶)۔ ذ (۲۴۷)۔ ر (۲۴۸)۔ ز (۲۴۹)۔ س (۲۵۰)۔ ص (۲۵۱)۔ ی (۲۵۲)۔ ع (۲۵۳)۔ ف (۲۵۴)۔ ق (۲۵۵)۔ ک (۲۵۶)۔ گ (۲۵۷)۔ خ (۲۵۸)۔ د (۲۵۹)۔ ذ (۲۶۰)۔ ر (۲۶۱)۔ ز (۲۶۲)۔ س (۲۶۳)۔ ص (۲۶۴)۔ ی (۲۶۵)۔ ع (۲۶۶)۔ ف (۲۶۷)۔ ق (۲۶۸)۔ ک (۲۶۹)۔ گ (۲۷۰)۔ خ (۲۷۱)۔ د (۲۷۲)۔ ذ (۲۷۳)۔ ر (۲۷۴)۔ ز (۲۷۵)۔ س (۲۷۶)۔ ص (۲۷۷)۔ ی (۲۷۸)۔ ع (۲۷۹)۔ ف (۲۸۰)۔ ق (۲۸۱)۔ ک (۲۸۲)۔ گ (۲۸۳)۔ خ (۲۸۴)۔ د (۲۸۵)۔ ذ (۲۸۶)۔ ر (۲۸۷)۔ ز (۲۸۸)۔ س (۲۸۹)۔ ص (۲۹۰)۔ ی (۲۹۱)۔ ع (۲۹۲)۔ ف (۲۹۳)۔ ق (۲۹۴)۔ ک (۲۹۵)۔ گ (۲۹۶)۔ خ (۲۹۷)۔ د (۲۹۸)۔ ذ (۲۹۹)۔ ر (۳۰۰)۔ ز (۳۰۱)۔ س (۳۰۲)۔ ص (۳۰۳)۔ ی (۳۰۴)۔ ع (۳۰۵)۔ ف (۳۰۶)۔ ق (۳۰۷)۔ ک (۳۰۸)۔ گ (۳۰۹)۔ خ (۳۱۰)۔ د (۳۱۱)۔ ذ (۳۱۲)۔ ر (۳۱۳)۔ ز (۳۱۴)۔ س (۳۱۵)۔ ص (۳۱۶)۔ ی (۳۱۷)۔ ع (۳۱۸)۔ ف (۳۱۹)۔ ق (۳۲۰)۔ ک (۳۲۱)۔ گ (۳۲۲)۔ خ (۳۲۳)۔ د (۳۲۴)۔ ذ (۳۲۵)۔ ر (۳۲۶)۔ ز (۳۲۷)۔ س (۳۲۸)۔ ص (۳۲۹)۔ ی (۳۳۰)۔ ع (۳۳۱)۔ ف (۳۳۲)۔ ق (۳۳۳)۔ ک (۳۳۴)۔ گ (۳۳۵)۔ خ (۳۳۶)۔ د (۳۳۷)۔ ذ (۳۳۸)۔ ر (۳۳۹)۔ ز (۳۴۰)۔ س (۳۴۱)۔ ص (۳۴۲)۔ ی (۳۴۳)۔ ع (۳۴۴)۔ ف (۳۴۵)۔ ق (۳۴۶)۔ ک (۳۴۷)۔ گ (۳۴۸)۔ خ (۳۴۹)۔ د (۳۵۰)۔ ذ (۳۵۱)۔ ر (۳۵۲)۔ ز (۳۵۳)۔ س (۳۵۴)۔ ص (۳۵۵)۔ ی (۳۵۶)۔ ع (۳۵۷)۔ ف (۳۵۸)۔ ق (۳۵۹)۔ ک (۳۶۰)۔ گ (۳۶۱)۔ خ (۳۶۲)۔ د (۳۶۳)۔ ذ (۳۶۴)۔ ر (۳۶۵)۔ ز (۳۶۶)۔ س (۳۶۷)۔ ص (۳۶۸)۔ ی (۳۶۹)۔ ع (۳۷۰)۔ ف (۳۷۱)۔ ق (۳۷۲)۔ ک (۳۷۳)۔ گ (۳۷۴)۔ خ (۳۷۵)۔ د (۳۷۶)۔ ذ (۳۷۷)۔ ر (۳۷۸)۔ ز (۳۷۹)۔ س (۳۸۰)۔ ص (۳۸۱)۔ ی (۳۸۲)۔ ع (۳۸۳)۔ ف (۳۸۴)۔ ق (۳۸۵)۔ ک (۳۸۶)۔ گ (۳۸۷)۔ خ (۳۸۸)۔ د (۳۸۹)۔ ذ (۳۹۰)۔ ر (۳۹۱)۔ ز (۳۹۲)۔ س (۳۹۳)۔ ص (۳۹۴)۔ ی (۳۹۵)۔ ع (۳۹۶)۔ ف (۳۹۷)۔ ق (۳۹۸)۔ ک (۳۹۹)۔ گ (۴۰۰)۔ خ (۴۰۱)۔ د (۴۰۲)۔ ذ (۴۰۳)۔ ر (۴۰۴)۔ ز (۴۰۵)۔ س (۴۰۶)۔ ص (۴۰۷)۔ ی (۴۰۸)۔ ع (۴۰۹)۔ ف (۴۱۰)۔ ق (۴۱۱)۔ ک (۴۱۲)۔ گ (۴۱۳)۔ خ (۴۱۴)۔ د (۴۱۵)۔ ذ (۴۱۶)۔ ر (۴۱۷)۔ ز (۴۱۸)۔ س (۴۱۹)۔ ص (۴۲۰)۔ ی (۴۲۱)۔ ع (۴۲۲)۔ ف (۴۲۳)۔ ق (۴۲۴)۔ ک (۴۲۵)۔ گ (۴۲۶)۔ خ (۴۲۷)۔ د (۴۲۸)۔ ذ (۴۲۹)۔ ر (۴۳۰)۔ ز (۴۳۱)۔ س (۴۳۲)۔ ص (۴۳۳)۔ ی (۴۳۴)۔ ع (۴۳۵)۔ ف (۴۳۶)۔ ق (۴۳۷)۔ ک (۴۳۸)۔ گ (۴۳۹)۔ خ (۴۴۰)۔ د (۴۴۱)۔ ذ (۴۴۲)۔ ر (۴۴۳)۔ ز (۴۴۴)۔ س (۴۴۵)۔ ص (۴۴۶)۔ ی (۴۴۷)۔ ع (۴۴۸)۔ ف (۴۴۹)۔ ق (۴۵۰)۔ ک (۴۵۱)۔ گ (۴۵۲)۔ خ (۴۵۳)۔ د (۴۵۴)۔ ذ (۴۵۵)۔ ر (۴۵۶)۔ ز (۴۵۷)۔ س (۴۵۸)۔ ص (۴۵۹)۔ ی (۴۶۰)۔ ع (۴۶۱)۔ ف (۴۶۲)۔ ق (۴۶۳)۔ ک (۴۶۴)۔ گ (۴۶۵)۔ خ (۴۶۶)۔ د (۴۶۷)۔ ذ (۴۶۸)۔ ر (۴۶۹)۔ ز (۴۷۰)۔ س (۴۷۱)۔ ص (۴۷۲)۔ ی (۴۷۳)۔ ع (۴۷۴)۔ ف (۴۷۵)۔ ق (۴۷۶)۔ ک (۴۷۷)۔ گ (۴۷۸)۔ خ (۴۷۹)۔ د (۴۸۰)۔ ذ (۴۸۱)۔ ر (۴۸۲)۔ ز (۴۸۳)۔ س (۴۸۴)۔ ص (۴۸۵)۔ ی (۴۸۶)۔ ع (۴۸۷)۔ ف (۴۸۸)۔ ق (۴۸۹)۔ ک (۴۹۰)۔ گ (۴۹۱)۔ خ (۴۹۲)۔ د (۴۹۳)۔ ذ (۴۹۴)۔ ر (۴۹۵)۔ ز (۴۹۶)۔ س (۴۹۷)۔ ص (۴۹۸)۔ ی (۴۹۹)۔ ع (۵۰۰)۔ ف (۵۰۱)۔ ق (۵۰۲)۔ ک (۵۰۳)۔ گ (۵۰۴)۔ خ (۵۰۵)۔ د (۵۰۶)۔ ذ (۵۰۷)۔ ر (۵۰۸)۔ ز (۵۰۹)۔ س (۵۱۰)۔ ص (۵۱۱)۔ ی (۵۱۲)۔ ع (۵۱۳)۔ ف (۵۱۴)۔ ق (۵۱۵)۔ ک (۵۱۶)۔ گ (۵۱۷)۔ خ (۵۱۸)۔ د (۵۱۹)۔ ذ (۵۲۰)۔ ر (۵۲۱)۔ ز (۵۲۲)۔ س (۵۲۳)۔ ص (۵۲۴)۔ ی (۵۲۵)۔ ع (۵۲۶)۔ ف (۵۲۷)۔ ق (۵۲۸)۔ ک (۵۲۹)۔ گ (۵۳۰)۔ خ (۵۳۱)۔ د (۵۳۲)۔ ذ (۵۳۳)۔ ر (۵۳۴)۔ ز (۵۳۵)۔ س (۵۳۶)۔ ص (۵۳۷)۔ ی (۵۳۸)۔ ع (۵۳۹)۔ ف (۵۴۰)۔ ق (۵۴۱)۔ ک (۵۴۲)۔ گ (۵۴۳)۔ خ (۵۴۴)۔ د (۵۴۵)۔ ذ (۵۴۶)۔ ر (۵۴۷)۔ ز (۵۴۸)۔ س (۵۴۹)۔ ص (۵۵۰)۔ ی (۵۵۱)۔ ع (۵۵۲)۔ ف (۵۵۳)۔ ق (۵۵۴)۔ ک (۵۵۵)۔ گ (۵۵۶)۔ خ (۵۵۷)۔ د (۵۵۸)۔ ذ (۵۵۹)۔ ر (۵۶۰)۔ ز (۵۶۱)۔ س (۵۶۲)۔ ص (۵۶۳)۔ ی (۵۶۴)۔ ع (۵۶۵)۔ ف (۵۶۶)۔ ق (۵۶۷)۔ ک (۵۶۸)۔ گ (۵۶۹)۔ خ (۵۷۰)۔ د (۵۷۱)۔ ذ (۵۷۲)۔ ر (۵۷۳)۔ ز (۵۷۴)۔ س (۵۷۵)۔ ص (۵۷۶)۔ ی (۵۷۷)۔ ع (۵۷۸)۔ ف (۵۷۹)۔ ق (۵۸۰)۔ ک (۵۸۱)۔ گ (۵۸۲)۔ خ (۵۸۳)۔ د (۵۸۴)۔ ذ (۵۸۵)۔ ر (۵۸۶)۔ ز (۵۸۷)۔ س (۵۸۸)۔ ص (۵۸۹)۔ ی (۵۹۰)۔ ع (۵۹۱)۔ ف (۵۹۲)۔ ق (۵۹۳)۔ ک (۵۹۴)۔ گ (۵۹۵)۔ خ (۵۹۶)۔ د (۵۹۷)۔ ذ (۵۹۸)۔ ر (۵۹۹)۔ ز (۶۰۰)۔ س (۶۰۱)۔ ص (۶۰۲)۔ ی (۶۰۳)۔ ع (۶۰۴)۔ ف (۶۰۵)۔ ق (۶۰۶)۔ ک (۶۰۷)۔ گ (۶۰۸)۔ خ (۶۰۹)۔ د (۶۱۰)۔ ذ (۶۱۱)۔ ر (۶۱۲)۔ ز (۶۱۳)۔ س (۶۱۴)۔ ص (۶۱۵)۔ ی (۶۱۶)۔ ع (۶۱۷)۔ ف (۶۱۸)۔ ق (۶۱۹)۔ ک (۶۲۰)۔ گ (۶۲۱)۔ خ (۶۲۲)۔ د (۶۲۳)۔ ذ (۶۲۴)۔ ر (۶۲۵)۔ ز (۶۲۶)۔ س (۶۲۷)۔ ص (۶۲۸)۔ ی (۶۲۹)۔ ع (۶۳۰)۔ ف (۶۳۱)۔ ق (۶۳۲)۔ ک (۶۳۳)۔ گ (۶۳۴)۔ خ (۶۳۵)۔ د (۶۳۶)۔ ذ (۶۳۷)۔ ر (۶۳۸)۔ ز (۶۳۹)۔ س (۶۴۰)۔ ص (۶۴۱)۔ ی (۶۴۲)۔ ع (۶۴۳)۔ ف (۶۴۴)۔ ق (۶۴۵)۔ ک (۶۴۶)۔ گ (۶۴۷)۔ خ (۶۴۸)۔ د (۶۴۹)۔ ذ (۶۵۰)۔ ر (۶۵۱)۔ ز (۶۵۲)۔ س (۶۵۳)۔ ص (۶۵۴)۔ ی (۶۵۵)۔ ع (۶۵۶)۔ ف (۶۵۷)۔ ق (۶۵۸)۔ ک (۶۵۹)۔ گ (۶۶۰)۔ خ (۶۶۱)۔ د (۶۶۲)۔ ذ (۶۶۳)۔ ر (۶۶۴)۔ ز (۶۶۵)۔ س (۶۶۶)۔ ص (۶۶۷)۔ ی (۶۶۸)۔ ع (۶۶۹)۔ ف (۶۷۰)۔ ق (۶۷۱)۔ ک (۶۷۲)۔ گ (۶۷۳)۔ خ (۶۷۴)۔ د (۶۷۵)۔ ذ (۶۷۶)۔ ر (۶۷۷)۔ ز (۶۷۸)۔ س (۶۷۹)۔ ص (۶۸۰)۔ ی (۶۸۱)۔ ع (۶۸۲)۔ ف (۶۸۳)۔ ق (۶۸۴)۔ ک (۶۸۵)۔ گ (۶۸۶)۔ خ (۶۸۷)۔ د (۶۸۸)۔ ذ (۶۸۹)۔ ر (۶۹۰)۔ ز (۶۹۱)۔ س (۶۹۲)۔ ص (۶۹۳)۔ ی (۶۹۴)۔ ع (۶۹۵)۔ ف (۶۹۶)۔ ق (۶۹۷)۔ ک (۶۹۸)۔ گ (۶۹۹)۔ خ (۷۰۰)۔ د (۷۰۱)۔ ذ (۷۰۲)۔ ر (۷۰۳)۔ ز (۷۰۴)۔ س (۷۰۵)۔ ص (۷۰۶)۔ ی (۷۰۷)۔ ع (۷۰۸)۔ ف (۷۰۹)۔ ق (۷۱۰)۔ ک (۷۱۱)۔ گ (۷۱۲)۔ خ (۷۱۳)۔ د (۷۱۴)۔ ذ (۷۱۵)۔ ر (۷۱۶)۔ ز (۷۱۷)۔ س (۷۱۸)۔ ص (۷۱۹)۔ ی (۷۲۰)۔ ع (۷۲۱)۔ ف (۷۲۲)۔ ق (۷۲۳)۔ ک (۷۲۴)۔ گ (۷۲۵)۔ خ (۷۲۶)۔ د (۷۲۷)۔ ذ (۷۲۸)۔ ر (۷۲۹)۔ ز (۷۳۰)۔ س (۷۳۱)۔ ص (۷۳۲)۔ ی (۷۳۳)۔ ع (۷۳۴)۔ ف (۷۳۵)۔ ق (۷۳۶)۔ ک (۷۳۷)۔ گ (۷۳۸)۔ خ (۷۳۹)۔ د (۷۴۰)۔ ذ (۷۴۱)۔ ر (۷۴۲)۔ ز (۷۴۳)۔ س (۷۴۴)۔ ص (۷۴۵)۔ ی (۷۴۶)۔ ع (۷۴۷)۔ ف (۷۴۸)۔ ق (۷۴۹)۔ ک (۷۵۰)۔ گ (۷۵۱)۔ خ (۷۵۲)۔ د (۷۵۳)۔ ذ (۷۵۴)۔ ر (۷۵۵)۔ ز (۷۵۶)۔ س (۷۵۷)۔ ص (۷۵۸)۔ ی (۷۵۹)۔ ع (۷۶۰)۔ ف (۷۶۱)۔ ق (۷۶۲)۔ ک (۷۶۳)۔ گ (۷۶۴)۔ خ (۷۶۵)۔ د (۷۶۶)۔ ذ (۷۶۷)۔ ر (۷۶۸)۔ ز (۷۶۹)۔ س (۷۷۰)۔ ص (۷۷۱)۔ ی (۷۷۲)۔ ع (۷۷۳)۔ ف (۷۷۴)۔ ق (۷۷۵)۔ ک (۷۷۶)۔ گ (۷۷۷)۔ خ (۷۷۸)۔ د (۷۷۹)۔ ذ (۷۸۰)۔ ر (۷۸۱)۔ ز (۷۸۲)۔ س (۷۸۳)۔ ص (۷۸۴)۔ ی (۷۸۵)۔ ع (۷۸۶)۔ ف (۷۸۷)۔ ق (۷۸۸)۔ ک (۷۸۹)۔ گ (۷۹۰)۔ خ (۷۹۱)۔ د (۷۹۲)۔ ذ (۷۹۳)۔ ر (۷۹۴)۔ ز (۷۹۵)۔ س (۷۹۶)۔ ص (۷۹۷)۔ ی (۷۹۸)۔ ع (۷۹۹)۔ ف (۸۰۰)۔ ق (۸۰۱)۔ ک (۸۰۲)۔ گ (۸۰۳)۔ خ (۸۰۴)۔ د (۸۰۵)۔ ذ (۸۰۶)۔ ر (۸۰۷)۔ ز (۸۰۸)۔ س (۸۰۹)۔ ص (۸۱۰)۔ ی (۸۱۱)۔ ع (۸۱۲)۔ ف (۸۱۳)۔ ق (۸۱۴)۔ ک (۸۱۵)۔ گ (۸۱۶)۔ خ (۸۱۷)۔ د (۸۱۸)۔ ذ (۸۱۹)۔ ر (۸۲۰)۔ ز (۸۲۱)۔ س (۸۲۲)۔ ص (۸۲۳)۔ ی (۸۲۴)۔ ع (۸۲۵)۔ ف (۸۲۶)۔ ق (۸۲۷)۔ ک (۸۲۸)۔ گ (۸۲۹)۔ خ (۸۳۰)۔ د (۸۳۱)۔ ذ (۸۳۲)۔ ر (۸۳۳)۔ ز (۸۳۴)۔ س (۸۳۵)۔ ص (۸۳۶)۔ ی (۸۳۷)۔ ع (۸۳۸)۔ ف (۸۳۹)۔ ق (۸۴۰)۔ ک (۸۴۱)۔ گ (۸۴۲)۔ خ (۸۴۳)۔ د (۸۴۴)۔ ذ (۸۴۵)۔ ر (۸۴۶)۔ ز (۸۴۷)۔ س (۸۴۸)۔ ص (۸۴۹)۔ ی (۸۵۰)۔ ع (۸۵۱)۔ ف (۸۵۲)۔ ق (۸۵۳)۔ ک (۸۵۴)۔ گ (۸۵۵)۔ خ (۸۵۶)۔ د (۸۵۷)۔ ذ (۸۵۸)۔ ر (۸۵۹)۔ ز (۸۶۰)۔ س (۸۶۱)۔ ص (۸۶۲)۔ ی (۸۶۳)۔ ع (۸۶۴)۔ ف (۸۶۵)۔ ق (۸۶۶)۔ ک (۸۶۷)۔ گ (۸۶۸)۔ خ (۸۶۹)۔ د (۸۷۰)۔ ذ (۸۷۱)۔ ر (۸۷۲)۔ ز (۸۷۳)۔ س (۸۷۴)۔ ص (۸۷۵)۔ ی (۸۷۶)۔ ع (۸۷۷)۔ ف (۸۷۸)۔ ق (۸۷۹)۔ ک (۸۸۰)۔ گ (۸۸۱)۔ خ (۸۸۲)۔ د (۸۸۳)۔ ذ (۸۸۴)۔ ر (۸۸۵)۔ ز (۸۸۶)۔ س (۸۸۷)۔ ص (۸۸۸)۔ ی (۸۸۹)۔ ع (۸۹۰)۔ ف (۸۹۱)۔ ق (۸۹۲)۔ ک (۸۹۳)۔ گ (۸۹۴)۔ خ (۸۹۵)۔ د (۸۹۶)۔ ذ (۸۹۷)۔ ر (۸۹۸)۔ ز (۸۹۹)۔ س (۹۰۰)۔ ص (۹۰۱)۔ ی (۹۰۲)۔ ع (۹۰۳)۔ ف (۹۰۴)۔ ق (۹۰۵)۔ ک (۹۰۶)۔ گ (۹۰۷)۔ خ (۹۰۸)۔ د (۹۰۹)۔ ذ (۹۱۰)۔ ر (۹۱۱)۔ ز (۹۱۲)۔ س (۹۱۳)۔ ص (۹۱۴)۔ ی (۹۱۵)۔ ع (۹۱۶)۔ ف (۹۱۷)۔ ق (۹۱۸)۔ ک (۹۱۹)۔ گ (۹۲۰)۔ خ (۹۲۱)۔ د (۹۲۲)۔ ذ (۹۲۳)۔ ر (۹۲۴)۔ ز (۹۲۵)۔ س (۹۲۶)۔ ص (۹۲۷)۔ ی (۹۲۸)۔ ع (۹۲۹)۔ ف (۹۳۰)۔ ق (۹۳۱)۔ ک (۹۳۲)۔ گ (۹۳۳)۔ خ (۹۳۴)۔ د (۹۳۵)۔ ذ (۹۳۶)۔ ر (۹۳۷)۔ ز (۹۳۸)۔ س (۹۳۹)۔ ص (۹۴۰)۔ ی (۹۴۱)۔ ع (۹۴۲)۔ ف (۹۴۳)۔ ق (۹۴۴)۔ ک (۹۴۵)۔ گ (۹۴۶)۔ خ (۹۴۷)۔ د (۹۴۸)۔ ذ (۹۴۹)۔ ر (۹۵۰)۔ ز (۹۵۱)۔ س (۹۵۲)۔ ص (۹۵۳)۔ ی (۹۵۴)۔ ع (۹۵۵)۔ ف (۹۵۶)۔ ق (۹۵۷)۔ ک (۹۵۸)۔ گ (۹۵۹)۔ خ (۹۶۰)۔ د (۹۶۱)۔ ذ (۹۶۲)۔ ر (۹۶۳)۔ ز (۹۶۴)۔ س (۹۶۵)۔ ص (۹۶۶)۔ ی (۹۶۷)۔ ع (۹۶۸)۔ ف (۹۶۹)۔ ق (۹۷۰)۔ ک (۹۷۱)۔ گ (۹۷۲)۔ خ (۹۷۳)۔ د (۹۷۴)۔ ذ (۹۷۵)۔ ر (۹۷۶)۔ ز (۹۷۷)۔ س (۹۷۸)۔ ص (۹۷۹)۔ ی (۹۸۰)۔ ع (۹۸۱)۔ ف (۹۸۲)۔ ق (۹۸۳)۔ ک (۹۸۴)۔ گ (۹۸۵)۔ خ (۹۸۶)۔ د (۹۸۷)۔ ذ (۹۸۸)۔ ر (۹۸۹)۔ ز (۹۹۰)۔ س (۹۹۱)۔ ص (۹۹۲)۔ ی (۹۹۳)۔ ع (۹۹۴)۔ ف (۹۹۵)۔ ق (۹۹۶)۔ ک (۹۹۷)۔ گ (۹۹۸)۔ خ (۹۹۹)۔ د (۱۰۰۰)۔ ذ (۱۰۰۱)۔ ر (۱۰۰۲)۔ ز (۱۰۰۳)۔ س (۱۰۰۴)۔ ص (۱۰۰۵)۔ ی (۱۰۰۶)۔ ع (۱۰۰۷)۔ ف (۱۰۰۸)۔ ق (۱۰۰۹)۔ ک (۱۰۱۰)۔ گ (۱۰۱۱)۔ خ (۱۰۱۲)۔ د (۱۰۱۳)۔ ذ (۱۰۱۴)۔ ر (۱۰۱۵)۔ ز (۱۰۱۶)۔ س (۱۰۱۷)۔ ص (۱۰۱۸)۔ ی (۱۰۱۹)۔ ع (۱۰۲۰)۔ ف (۱۰۲۱)۔ ق (۱۰۲۲)۔ ک (۱۰۲۳)۔ گ (۱۰۲۴)۔ خ (۱۰۲۵)۔ د (۱۰۲۶)۔ ذ (۱۰۲۷)۔ ر (۱۰۲۸)۔ ز (۱۰۲۹)۔ س (۱۰۳۰)۔ ص (۱۰۳۱)۔ ی (۱۰۳۲)۔ ع (۱۰۳۳)۔ ف (۱۰۳۴)۔ ق (۱۰۳۵)۔ ک (۱۰۳۶)۔ گ (۱۰۳۷)۔ خ (۱۰۳۸)۔ د (۱۰۳۹)۔ ذ (۱۰۴۰)۔ ر (۱۰۴۱)۔ ز (۱۰۴۲)۔ س (۱۰۴۳)۔ ص (۱۰۴۴)۔ ی (۱۰۴۵)۔ ع (۱۰۴۶)۔ ف (۱۰۴۷)۔ ق (۱۰۴۸)۔ ک (۱۰۴۹)۔ گ (۱۰۵۰)۔ خ (۱۰۵۱)۔ د (۱۰۵۲)۔ ذ (۱۰۵۳)۔ ر (۱۰۵۴)۔ ز (۱۰۵۵)۔ س (۱۰۵۶)۔ ص (۱۰۵۷)۔ ی (۱۰۵۸)۔ ع (۱۰۵۹)۔ ف (۱۰۶۰)۔ ق (۱۰۶۱)۔ ک (۱۰۶۲)۔ گ (۱۰۶۳)۔ خ (۱۰۶۴)۔ د (۱۰۶۵)۔ ذ (۱۰۶۶)۔ ر (۱۰۶۷)۔ ز (۱۰۶۸)۔ س (۱۰۶۹)۔ ص (۱۰۷۰)۔ ی (۱۰۷۱)۔ ع (۱۰۷۲)۔ ف (۱۰۷۳)۔ ق (۱۰۷۴)۔ ک (۱۰۷۵)۔ گ (۱۰۷۶)۔ خ (۱۰۷۷)۔ د (۱۰۷۸)۔ ذ (۱۰۷۹)۔ ر (۱۰۸۰)۔ ز (۱۰۸۱)۔ س (۱۰۸۲)۔ ص (۱۰۸۳)۔ ی (۱۰۸۴)۔ ع (۱۰۸۵)۔ ف (۱۰۸۶)۔ ق (۱۰۸۷)۔ ک (۱۰۸۸)۔ گ (۱۰۸۹)۔ خ (۱۰۹۰)۔ د (۱۰۹۱)۔ ذ (۱۰۹۲)۔ ر (۱۰۹۳)۔ ز (۱۰۹۴)۔ س (۱۰۹۵)۔ ص (۱۰۹۶)۔ ی (۱۰۹۷)۔ ع (۱۰۹۸)۔ ف (۱۰۹۹)۔ ق (۱۱۰۰)۔ ک (۱۱۰۱)۔ گ (۱۱۰۲)۔ خ (۱۱۰۳)۔ د (۱۱۰۴)۔ ذ (۱۱۰۵)۔ ر (۱۱۰۶)۔ ز (۱۱۰۷)۔ س (۱۱۰۸)۔ ص (۱۱۰۹)۔ ی (۱۱۱۰)۔ ع (۱۱۱۱)۔ ف (۱۱۱۲)۔ ق (۱۱۱۳)۔ ک (۱۱۱۴)۔ گ (۱۱۱۵)۔ خ (۱۱۱۶)۔ د (۱۱۱۷)۔ ذ (۱۱۱۸)۔ ر (۱۱۱۹)۔ ز (۱۱۲۰)۔ س (۱۱۲۱)۔ ص (۱۱۲۲)۔ ی (۱۱۲۳)۔ ع (۱۱۲۴)۔ ف (۱۱۲۵)۔ ق (۱۱۲۶)۔ ک (۱۱۲۷)۔ گ (۱۱۲۸)۔ خ (۱۱۲۹)۔ د (۱۱۳۰)۔ ذ (۱۱۳۱)۔ ر (۱۱۳۲)۔ ز (۱۱۳۳)۔ س (۱۱۳۴)۔ ص (۱۱۳۵)۔ ی (۱۱۳۶)۔ ع (۱۱۳۷)۔ ف (۱۱۳۸)۔ ق (۱۱۳۹)۔ ک (۱۱۴۰)۔ گ (۱۱۴۱)۔ خ (۱۱۴۲)۔ د (۱۱۴۳)۔ ذ (۱۱۴۴)۔ ر (۱۱۴۵)۔ ز (۱۱۴۶)۔ س (۱۱۴۷)۔ ص (۱۱۴۸)۔ ی (۱

کا احساس پیدا کرے کہ اس کا اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنے حقیقی رب کی معرفت محسوس کیا اس کے ساتھ بندگی کے تعلق کو پورے شعور و ادراک کے ساتھ قائم کر لے، ٹھیک اسی طرح جیسا کہ خود رب ذو الجلال نے فرمایا ہے:

اَنْزَلَكُمْ اللّٰهُ الْاِنۡشِیَ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ... نَدۡکُرُوۡنَ (سورہ یونس: ۳)

ترجمہ: ”بے شک تمہارا رب اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر مستکن ہو گیا تدبیر امر کر رہا ہے۔ اس کی اجازت کے بغیر کوئی سفارش کرنے والا نہیں، یہ ہے اللہ تمہارا رب پس تم اسی کی عبادت کرو، کیا تم نصیحت قبول نہیں کرتے۔“

یعنی اللہ تمہارا رب وہ عظیم اور حکیم و قدیر ہستی ہے جس نے اس کائنات کو بتدریج منصوبے اور پلاننگ کے ساتھ خلق فرمایا پھر عرش عظیم پر مستکن ہے اور تدبیر امر کر رہا ہے یعنی اس کے کام کو اہل اور انتہائی مستحکم قوانین کے تحت چلا رہا ہے۔ اس کی کائنات کے کسی گوشہ میں کوئی نقص نہیں۔ اس کے ایک ایک ذرہ پر اس کا مکمل کنٹرول ہے۔ اس کے علم و مشیت کے بغیر نہ کوئی ذرہ حرکت کر سکتا ہے اور نہ کوئی پتہ گر سکتا ہے۔ وہ بے شمار مخلوقات کا خالق و رازق اور پالنا رہا ہے۔ ہر لمحہ سب کی سنتا ہے اور ہر ایک کی ضرورت پوری کرتا ہے۔ اس کی قدرت، حکمت، توانائی و صلاحیتیں اور اختیارات لامحدود ہیں اور اس کی ذات کسی بھی کمزوری اور ناتوانی سے منہ اور اعلیٰ وارفع ہے۔ کسی فرشتے، نبی یا ولی کی کیا مجال کہ کوئی اس کے ارادے، مشیت یا فیصلے میں مداخلت ہو۔ جن وانس، جنی و ولی سب اس کی مخلوق ہیں قوانین فطرت کے پابند ہیں محدود توانائیوں اور صلاحیتوں کے حامل ہیں سب ہی اس کے سامنے مجبور و بے بس ہیں، اس کے محتاج ہیں صرف ایک اس کی ذات غنی ہے اور سب اس کے ور کے سوا ہی ہیں۔ یہ ہے اللہ تمہارے رب کی شان!۔ پوری کائنات اور اس کا نظام اس کے قبضہ قدرت میں ہے جس و قمر کی گردش بلکہ تمام اجسام فلکی کا نظام اسی کے حکم کے ماتحت ہے۔ ہواؤں کا چلنا، بارش کا برسنا، فصلوں کا اگنا سب کچھ اسی کے اذن و مشیت پر منحصر ہے۔ نفع و نقصان سب اس کی مٹھی میں ہے۔ عزت و ذلت اور اقتدار، افرات و اقوام کی خوش حالی و بد حالی سب اس کے ہاتھ میں ہے، کوئی اس کا حصہ دار نہیں ہے۔ دنیا عالم اسباب ہے یہاں ہر عام اسباب کے تحت چل رہا ہے اور تمام اسباب خالق اسباب کے تابع اور اس کے اذن و مشیت کے ماتحت ہیں لہذا صرف اور صرف اسی کی ذات مافوق الاسباب یعنی اسباب سے بالاتر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء علیہم السلام اور اپنے آخری نبی کو اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت (عبود و معبود کا تعلق اور انداز بندگی) سکھانے اور سمجھانے بھیجا اور انہوں نے اپنی ذات سے اس کا عملی نمونہ پیش کر کے دکھایا۔ انہوں نے عالم اسباب میں اسباب استعمال کرتے ہوئے ہی زندگی گزارنے کا ڈھنگ بتایا۔ تمام معاملات اور مسائل کو دائرہ اسباب کے اندر حل کرنے کا طریقہ سکھایا، تعویذ، کندوں وغیرہ کو شرک قرار دیا اور محروغیہ کو کفر و شرک ٹھہرایا۔ شرکاز، جھاڑ پھونک اور کھانے پینے کی چیزوں پر دم کو ممنوع قرار دیا گیا۔ پھر صحابہؓ اور تابعین و تبع تابعین (جنہیں نبیؐ نے خیر القرون فرمایا) اسی سواہ السبیل پر گامزن رہے اور کبھی اوپر اور کبھی نیچے نہ ہٹکے۔ وہ شرک سے پاک ایمان اور دین خالص کے ساتھ رب کی بندگی کا حق ادا کرتے رہے اللہ کی رحمت و نصرت ان کے شامل حال رہی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں علمی، سیاسی و اقتصادی عروج و کمال عطا فرمایا اور اقوام عالم پر برتری اور غلبہ دیا۔ بلاشبہ وہ اللہ کی عطا کردہ نعمت ایمانی کے سچے قدر دانوں کی ایک تاریخ ساز قوم تھی، ان کا دور انسانی تاریخ کا ایک قابل فخر و رشید باب ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان سے کچی و الہانہ محبت عطا فرمائے اور ان کے شخص قدم کی پیروی کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

لیکن یہ بھی امر واقعہ ہے کہ حالات کبھی ایک جیسے نہیں رہتے۔ عروج و کمال کے ساتھ انحطاط و زوال بھی لگا ہوا ہے۔ حامل کتاب امتوں کے اندر بگاڑ ان کے ”چڑھے لکھوں“ کے ہاتھوں ہی آتا ہے۔ شیطان ان پر وار کرتا ہے، ان کو پیش و طرب کا عادی اور لذت آفرینی

ولطف اندوزیوں کا دلدادہ بنا دیتا ہے۔ شیطان کے دام فریب میں گرفتار ہو کر دنیا سے محبت اور آخرت سے غفلت کا شکار ہو جاتے ہیں اور حامل کتاب ہوتے ہوئے ”ثم لم يحملواها“ کے مرض کا شکار ہو جاتے ہیں (یعنی کتاب کی تعلیم پر عمل نہیں کرتے) (سورۃ الجمد) اللہ کی کتاب ان کے سیناں پر بھی اور پڑھائی جاتی ہے لیکن محض قوی ورثہ اور رواج کے طور پر نہ کہ عمد ربانی کا حق ادا کرنے کے لیے۔ وہ دنیا کی بڑائی اور اس کے حصول میں مست ہو کر صراط مستقیم سے دور ہو جاتے ہیں، متاع دنیا کے پیچھے دوڑنے لگتے ہیں۔ پھر اپنے ہم نواؤں کے ساتھ مل کر اپنے زیر اثر عوام کو گمراہ کرنے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔ قرآن میں اس صورت حال کی منظر کشی کی گئی ہے:

فخلف من بعدهم خلف ورثوا الكتاب..... افلا تعقلون..... (الاعراف: ۱۶۹)

ترجمہ: ”پھر ان (خیر القرون) کے بعد ایسے لوگ ان کے جانشین ہوئے جو کتاب الہی کے وارث ہو کر متاع دنیا سمیٹتے ہیں اور رکھتے ہیں کہ ہمیں تو معاف کر ہی دیا جائے گا“ اور پھر وہ متاع دنیا سامنے آتی ہے تو لپک کر اس کو لئے لیتے ہیں۔ کیا ان سے کتاب کا عمد نہیں لیا جا چکا ہے کہ اللہ کے نام پر حق کے علاوہ کچھ نہ کہیں؟ اور یہ کتاب میں جو کچھ ہے اسے خود پڑھ بھی چکے ہیں۔ وارث آخرت تو متقیوں ہی کے لیے بہتر ہے۔ کیا تم اتنا بھی عقل سے کام نہیں لیتے؟“

یعنی خیر القرون کے بعد ایسے لوگ دین کے وارث بنے جن کے پاس اللہ کی کتاب محض ورثہ کے طور پر موجود ہے، اس کو پڑھتے اور پڑھاتے ہیں لیکن اس سے (ہدایت حاصل کر کے اس کو پھیلانے کی بجائے) دنیا کے مفادات سمیٹنے میں لگ جاتے ہیں۔ عمد ربانی کو فراموش کر کے کتاب اللہ کی ہدایت کو چھپا کر اس کو صرف دنیا کمانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ان کو یہ احساس بھی نہیں رہتا کہ دائمی نعمتوں والا آخرت کا گھر جو صرف متقیوں ہی کے لیے ہے اس دنیا کی عارضی متاع قلیل سے یقیناً ”بہتر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صورتحال کو مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ ہر نبی کے قبیح، مطیع و فرمانبردار اس کے حواری (صحابہ کرام) ہوتے ہیں۔ پھر ایسے لوگ آتے ہیں جو ”يقولون مالا يفعلون ويفعلون مالا يأمرون“ یعنی وہ جو کہتے ہیں کرتے نہیں اور ان کا عمل اللہ کے حکم کے خلاف ہوتا ہے۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں کے خلاف جہاد بالسیف یا جہاد باللسان کا حکم فرمایا ہے۔ (مسلم عن عبد اللہ بن مسعود) اب یہ اس نام نہاد امت مسلمہ کی بدھمیسی ہے کہ قرآن و حدیث کی نشاندہی کے مطابق (جو اگرچہ اس وقت کی حامل کتاب قوموں کے ناظر اور حوالہ سے ہی کی گئی تھی) یہ بھی اپنے اخبار و رہبان کے ہاتھوں (کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ) سے دور ہو کر بالکل اس طرح بدترین گمراہی کا شکار ہوئی ہے جیسے وہ ہولی ٹھیں۔ اللہ اور رسول پر ایمان کے یہ دعویدار شیطان اور اس کے آلہ کار شیاطین الانس کے دام فریب میں پھنس کر صراط مستقیم سے منحرف ہو کر کفر و شرک کی ہلاکت خیز راہوں میں بھٹکنے لگے ہیں۔ قبر پرستی، اوبہام پرستی ان کا دین ہے، مردے ان کے داتا و تنج بخش ہیں، ان کی قبروں پر چادریں اور چڑھاوے عرس و میلے ہیں۔ وہاں بدکار ملنگی قلندر اور چڑھی ان کو اولاد دیتے یا دلواتے ہیں۔ مشکل و مصیبت میں انہی سے امیدیں ہیں، انہی کی پکاریں ہیں، اغرض امید و بیم کا غائبانہ تعلق رب کی بجائے ان مردوں سے ہے اور مقررہ دنوں پر ان کے نام کی نذر و نیاز ہے۔ بالاخر شرک کی شکل میں اللہ کو گالی دینے والوں اور اس کے وقار و جلال سے بے اعتنائی برتنے والوں پر رب ذو الجلال کا قہر و غضب ٹوٹ پڑا ہے، چنانچہ صدیوں سے یہ امت ذلت و رسوائی سے دوچار ہے، ہر طرف خوں ریزی اور عورتوں کی آبروریزی ہے، بری طرح معاشی و اخلاقی پستی و بد حالی کا شکار ہیں۔ اقوام عالم جن کے یہ مقروض ہیں ان پر تھوک رہی ہیں۔ نام نہاد آزادی کے بعد تو اور بھی شدت کے ساتھ سہایتہ آقاؤں کے غلاموں کی غلامی کے شعلے میں جکڑ دئے گئے ہیں، کوئی بھی حامی و ناصر تو کیا ان کا پرسان حال بھی نظر نہیں آتا۔ اللہ کی نعمت کا، دولت ایمانی کا کفران کرنے والے حاملین کتاب پر دنیا میں بھی اللہ کے عذاب کا کوڑا برستا ہے اور یہ علامت ہے آخرت کے شدید و دائمی عذاب کی۔ مالک کا فرمان ہے:

الم تدرى الى الذين بدلوا نعم الله... الى النار..... (ابراہیمہ: ۲۸ تا ۳۰)

ترجمہ : ”تم نے دیکھا ان لوگوں کو جنہوں نے اللہ کی نعمت کو کفرانِ نعمت سے بدل ڈالا اور اپنی قوم کو (بھی) ہلاک میں جھونک دیا، یعنی جہنم جس میں وہ جھلکائے جائیں گے اور وہ بدترین ٹھکانہ ہے۔ انہوں نے اللہ کے کچھ بے شمار نعمتوں کو ماکہ وہ انہیں اس کے راستے سے بھٹکادیں؟ انہوں نے کچھ مڑے کر لو انجام کار تمہیں پلٹ کر جہنم میں ہی جانا ہے۔“

کفر و شرک اور قہر الہی کی ان گنتاوپ عظمتوں میں کتاب اللہ امید کی شعلے روشن کرتی ہے۔

والذین یمسکون بالکتاب..... اجر المصلحین..... (الاعراف: ۱۷۰)

ترجمہ : ”(رہے وہ لوگ) جو کتاب اللہ سے تمسک کرتے ہیں“ الصلوٰۃ قائم کرتے ہیں تو ایسے مصلحین کا عمل ہم نتائج نہیں کریں گے۔“

یعنی وہ سچیدہ ذمہ دار اور سلیم الفطرت لوگ جو متحدہ حیات کا شعور پیدا کر کے ”ایمان و عقیدہ کو شرک کی اکوڑگی سے پاک کر کے اللہ کی بندگی کے لیے اپنے دین کو خالص کر لیں اور خیر امت بن کر انہیں دعوت حق کے ذریعہ اصلاحی معن کے حامل بنیں تو ایسے ہی احتمالی مجاہدوں کی اللہ کے دین کو ضرورت ہے۔ یہ اللہ کی راہ میں جان و مال لگائیں اور اللہ تعالیٰ ان کو اپنے انعامات، بہت کی دائمی بہادریوں کا حقدار بنائے۔ اصحابِ اہل کے لیے ان کے مالک حقیقی نے کیا کچھ تیار کر کے رکھا ہے کوئی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ آج تو رب کے وعدہ پر یقین کا مرحلہ ہے، کل اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر ان کا دل حقیقی مسرت اور شادمانی سے سرشار ہو گا، بالخصوص جب یہ دیکھیں گے کہ آج جو آخرت سے بے فکر شیاطینِ الانس (بیویوں اور مولویوں) کا طوق فلانی اپنی گردنوں میں ڈالے ہوئے اندھے مقلدین کر گمراہی میں سرگرم ہیں، رب ذو الجلال ان کو چھانت کر علیحدہ کرے گا اور پھر ان کو نکال دیا جائے گا۔

..... الم اعهد الیکم بنسی ادم لان تعبدوا الشیطن..... مستقیم..... (البقرہ: ۱۷۰)

ترجمہ : ”آدم کے بچہ ایکامیں نے تم سے عہد نہیں لیا تھا کہ شیطان کی بندگی نہ کرنا، وہ تمہارا کھلا دشمن ہے اور میری ہی بندگی کرتے رہتا۔ یہ سیدھا راستہ ہے۔“

تو اس وقت جہاں ان کا کام دنیا مراءوں کو احتمالی باوجود اور ذلت و رسوائی کا احساس ہو گا، نہ امت کی شدت میں اپنے ہاتھ کاغذیں گے اور آرزو کریں گے کہ پھر دنیا میں بھیج دے جائیں کہ کچھ ماضی کی غلطی کر لیں، لیکن یہ آرزو خاک میں مل جائے گی، دوسری طرف اصحابِ اہل کے پاس رب رحیم کے پاس سے ”سلام“ قبولاً، ”من ربہ رحیم“ کے پیغامات موصول ہوں گے، اس لیے کہ یہ رب ذو الجلال والاکرام کے مہمان ہوں گے۔

بارگاہِ رب العزت میں دست بدعا ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایمان خالص و ثابت کے ساتھ اپنے دین کے ساتھ اپنے دین کے غماضے پر رے کرنے کی توفیق احسن سے نواز دے اور ہمارے اپنے ان بندوں میں شامل فرمائے جن کے لیے وعدہ ہے کہ:

ان الذین آمنوا و عملوا الصالحات یہدیہم ربہم ربهم بایمانہم..... (النور: ۷۰)

ترجمہ : ”جو لوگ (شرک سے پاک) ایمان لاکر عمل صالح کرتے رہے انہیں ان کا رب ان کے ایمان کی وجہ سے ہدایت سے نوازے گا۔ نعمت ہماری جنتوں میں ان کے لیے مہرے رواں ہوں گی۔ وہاں ان کی پکار ہو گی ”سبحنک اللہم“ (پاک ہے تو اے اللہ) اور ان کی دعا ہو گی ”سلام“ (یعنی سلامتی ہو)۔ اور ان کی ہر بات کا اہتمام ہو گا ”ان الحمد للہ رب العالمین“ (یعنی سب تعریف اللہ رب العالمین کے لیے ہی ہے)۔“

===== بقیۃ : قافلہ ہر رواں دواں =====

بعد ازاں کراچی کے سعید احمد صاحب نے سورۃ المؤمنون کی آیات ولقد خلقنا الانسان من نطفہ..... ثم انکم يوم القیمہ تبعثون۔ کے حوالے سے عذابِ قبر کے موضوع پر تقریر کی اور کتاب و سنت کے مختلف حوالوں سے عذابِ قبر یا عذابِ برزخ کے سلسلے میں وضاحت کی کہ اس کا تعلق اس معنی گڑھے (قبر) سے نہیں بلکہ برزخ سے ہے۔

سعید احمد صاحب کی تقریر کے بعد شرکاء اجتماع کے درمیان قرآن و حدیث پر مبنی معلوماتی پروگرام ہوا جس میں ساتھیوں نے بڑے ذوق و شوق سے حصہ لیا۔ یہ پروگرام مختلف موضوعات پر معلومات افزا ہونے کی وجہ سے خاصی دلچسپی کا باعث رہا۔ صلوٰۃ منہ کے وقفے سے قبل یہ تین روزہ تربیتی اجتماع امیر تنظیم کے اختتامی کلمات پر اختتام پذیر ہوا۔

تحریر
سَعِيدُ احْمَد

يُوسُفُ عَلَيْهِ السَّلَامُ

اللہ رب العزت نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے زمین پر انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا جو مختلف ادوار میں لوگوں کے پاس اللہ کا پیغام لے کر پہنچے۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ”بعض کو بعض پر“ (جزوی اعتبار سے) فضیلت عطا فرمائی۔ (البقرہ ۵۳، ۱۳۵، ۵۵)۔ یوسف علیہ السلام اس عظیم المرتبت سلسلے کے ایک برگزیدہ پیغمبر تھے جنہیں مالک الملک نے نبوت کے ساتھ اقتدار بھی عطا فرمایا۔ آپ کی حیات طیبہ کے واقعات کو جاننے کے لیے ہمارے پاس ایک نہایت ہی مستند اور جامع ماخذ سورۃ یوسف ہے۔ قرآن میں انبیاء علیہم السلام کے نام پر اور بھی سورتیں ہیں لیکن یہ سورۃ اس امتیازی خصوصیت کی حامل ہے کہ اس ایک ہی سورۃ میں یوسف علیہ السلام کی زندگی کے اہم حالات کو اتنی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ اس کے مطالعہ سے حیات طیبہ کے واقعات کی مکمل منظر کشی ہو جاتی ہے۔ یہاں یہ بات بھی ذہن نشین کر لی جائے کہ قرآن میں بیان کردہ واقعات تفریح طبع اور لطف اندوزی کے لیے ہرگز نہیں بلکہ عبرت و نصیحت کے لیے اور دعوت کے عظیم مقصد کو پورا کرنے کے لیے ہیں۔ چنانچہ یہ سورۃ جہاں یوسف علیہ السلام کی زندگی کو ہمارے لیے نصیحت و موعظت کے ایک بہترین مرقع اور اعلیٰ ترین نمونے کے طور پر پیش کرتی ہے وہاں کئی دور کے حالات میں یہ ایک اہم اور موثر دعوتی کردار ادا کرتی ہے۔ دراصل کفار مکہ نے یہودیوں کی ترغیب پر نبی علیہ السلام سے یعقوب علیہ السلام اور یوسف علیہ السلام کے بارے میں اور مصر میں ان کے داخلہ اور ممکن کے بارے میں جو سوال پوچھے، اس کے جواب میں یہ سورۃ نازل ہوئی۔ اس میں ان کو سمجھوڑا گیا:

○ لَقَدْ كَانَ لِيُوسُفُ وَأَخُوهُ ابْتِلَاءٌ مِّنَ اللَّهِ (يوسف: ۷)

ترجمہ: ”حقیقت تو یہ ہے کہ یوسف اور ان کے بھائیوں (کے واقعات) میں ان کو چھنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔“
یعنی اے مکہ والو! اس تاریخی واقعے میں تمہاری عبرت لگائی کا سامان ہے۔ تاریخ کے آئینے میں دیکھ لو کہ آج ہمارے نبیؐ کے ساتھ تمہارا کردار یوسفؑ کے بھائیوں سے کس قدر متماثل ہے۔ ہماری رحمت و نصرت سے ہمارا نبیؐ یوسفؑ کی طرح عزت و سرفرازی سے ہمکنار ہونے والا ہے جبکہ تم اپنی ظالمانہ و جاہلانہ روش سے ہمارے قہر و غضب کو دعوت وے کرذلت و رسوائی سے دوچار ہو کر رہو گے۔ سورۃ یوسف میں جو پیش گوئی بین السطور کی گئی تھی فتح مکہ نے اس کی عملاً تصدیق فرمادی۔ اس سورۃ کی اہمیت اور اس میں بیان کردہ واقعات کے اصلاحی پہلو کی قدر و منزلت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے خود ”احسن القصص“ فرمایا ہے:

○ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ..... لَعَنَ الْفٰكِلَيْنِ (يوسف: ۳)

ترجمہ: ”ہم اس قرآن کے ذریعے جو تمہیں وحی کیا گیا ہے تمہیں ایک بہترین قصہ سناتے ہیں، ورنہ اس سے پہلے تم اس سے بالکل بے خبر تھے۔“

اس ایک واقعے میں جس قدر ہجرت آموز مواقع و احوال کھینچا ملتے ہیں وہ تاریخ انسانیت میں اپنی مثال آپ ہے۔ چنانچہ یہ بلاشبہ ”حسن القصص“ ہے۔ اس سورۃ کے مطالعہ سے ہمارے سامنے یوسف علیہ السلام کا جو کردار آتا ہے وہ ایک ہمہ جہتی شخصیت کا حامل ہے اور اسکے مختلف پہلوؤں میں ہمیں جہاں ایک عالی نسب پیغمبر، حکیم و دانایا مبلغ و مبعوث، معاملہ فہم، منتظم اور زیرک و فہیم ماہر امور مملکت کے بلند پایہ اوصاف نظر آتے ہیں وہاں ایک لائق و فرمانبردار فرزند، محبت کرنے والا بھائی، مونس و غمگسار ساقی اور ایک انتہائی پاکباز، باکروار و باعصمت مثالی نوجوان، تقویٰ، صبر اور حلم و امانۃ کے اوصاف سے آراستہ، بے حد وفا شعار اور غیور انسان کی تصویر سامنے آتی ہے۔ درج ذیل طور میں ان پہلوؤں پر خصوصی طور سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

1۔ عالی نسب پیغمبر: علم الاقوام والانسانیہ کے محققین نے اقوام عالم کو اخلاق و عادات، اعتقادات اور زبان کے اتحاد و تشابہ اور اعضائے جسمانی اور ذہنی و فکر کی مماثلت کے لحاظ سے تین مختلف خاندانوں میں تقسیم کیا ہے: آریائی، تورانی اور سائی۔ سائی خاندان میں عربی، آرامی، سریانی، عبرانی وغیرہ قومیں شامل ہیں۔ یوسف علیہ السلام کا تعلق اسی موخر الذکر قوم سے ہے۔ اسی نسل سے تارح (آزر) اور اس سے ابراہیم علیہ السلام پیدا ہوئے۔ ان کی اولاد میں اسماعیل علیہ السلام سے بنو اسماعیل کی نسل چلی جو عرب کے وسطی اور ملحقہ علاقوں میں سکونت پذیر ہوئی اور اسحاق علیہ السلام کے بیٹے یعقوب علیہ السلام سے قوم بنو اسرائیل کا سلسلہ نسل جاری ہوا جو فلسطین، شام اور پھر مصر وغیرہ کے مملکت میں سکونت پذیر ہوئی اور دور انحطاط میں اوہرا دھر منتشر کر دی گئی۔ قرآن نے بھی اس کی تائید فرمائی ہے کہ اولاد ابراہیم کا تعلق نوح علیہ السلام کی ہی سلسلہ نسل سے تھا۔

○ سلام علی نوح فی العلمین..... وان من شیعۃ لابراہیم..... (التفہت: ۵۹ آ ۸۳)

ترجمہ: ”سارے عالموں میں نوح پر سلامتی ہو، تیکو کاروں کو ہم اسی طرح جزا دیا کرتے ہیں۔ بیشک وہ ہمارے مومن بندوں میں تھے۔ پھر ہم نے دو سروں کو غرقاب کر دیا اور اسی کے طریقے پر چلنے والوں میں سے ابراہیم بھی تھے۔“

قرآن میں متعدد مقامات پر ان دو خاندانوں کا ذکر ساتھ ساتھ کیا گیا ہے (ملاحظہ ہو سورۃ آل عمران ۳۳، ۳۴ اور سورۃ الحدید: ۲۶) یوسف علیہ السلام کے خاندان کو اللہ تعالیٰ نے یہ فضیلت عطا فرمائی کہ ان کی مسلسل تین پشتوں میں جلیل القدر انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ ”سب سے زیادہ عزت والا کون ہے۔“ آپ نے فرمایا ”جو سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے“ (كما قال اللہ تعالیٰ ”ان اکرمکم عند اللہ اتقکم“ الحجرات)۔ سائل نے کہا کہ ہم یہ نہیں پوچھتے۔ آپ نے فرمایا ”اکرام الناس یوسف نبی اللہ ابن نبی اللہ ابن خلیل اللہ“ یعنی سب سے زیادہ عزت والے یوسف نبی، نبی کے بیٹے کے بیٹے، خلیل اللہ کے بیٹے کے پوتے۔ ایک دوسری روایت میں الفاظ ہیں ”اکرم بن اکرم بن اکرم بن یوسف بن یعقوب بن اسمٰعیل بن ابراہیم۔“ یعنی عزت دار، عزت دار کے بیٹے، عزت دار کے پوتے اور خلیل اللہ کے پڑپوتے تھے۔ (بخاری کتاب بدء الخلق) کتاب التفسیر۔ مسلم کتاب النسا کل۔ خاندان یوسف کی جائے سکونت بھی فضیلت و برکت کی جگہ ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کی قوم نے دعوت حق کی مخالفت میں خلیل اللہ کو آگ میں ڈالا اور وہ اللہ کے حکم سے ان پر ٹھنڈی ہو گئی پھر آپ نے قوم و وطن سے مہاجرت کی، لوط علیہ السلام کی معیت میں وطن چھوڑا اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر فرمایا: انی مہاجر الی وہی (میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرتا ہوں: عجبوتہ: ۲۶)۔ دوسری جگہ فرمایا: انی فہب الی وہی سیہلین (میں اپنے رب کی طرف جاتا ہوں، وہی میری رہنمائی فرمائے گا)۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی رہنمائی فرمائی اور مقدس و بابرکت زمین میں ٹھکانہ عطا فرمایا:

○ ونجینہ و لوط الی الارض التی یزکنا فیہا العلمین ○..... (الانبیاء: ۷۱)

ترجمہ: ”اور ہم انھیں اور لوط کو نجات دے کر اس زمین کی طرف لے گئے جس میں ہم نے دنیا والوں کے لیے برکت رکھی ہے۔“

اور یہ برکت والی زمین وہی ہے جہاں اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم یلت الامری تشریف لے گئے تھے (سورۃ بنی اسرائیل ۸۰) یعنی ارض فلسطین جہاں مسجد اقصیٰ (قبلہ اول) ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کے بعد اسحق اور یعقوب یحییٰ رہائش پذیر رہے اس علاقہ کو کنعان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے پھر جب اللہ تعالیٰ نے یوسفؑ کو مصر میں تمکن عطا فرمایا تو یہ خاندان وہاں منتقل ہو گیا۔ سورۃ المؤمن میں فرعون کے دربار میں راجل مومن کی تقریر میں یوسف علیہ السلام کا ذکر ہے:

○ ولقد جاءکم یوسف من قبلہ بالبینۃ..... لن یبعث اللہ من بعدہ رسولا..... (المومن: ۲۴)

ترجمہ: ”اور بیشک اس سے پہلے تمہارے پاس یوسف کھلی نشانیاں لے کر آئے پھر تم ان چیزوں کے بارے میں جو وہ لے کر آئے تھے شک میں پڑے رہے یہاں تک کہ ان کی وفات ہو گئی، تم کہنے لگے کہ اللہ ان کے بعد ہرگز کوئی رسول مبعوث نہ فرمائے گا“ اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کا زمانہ موسیٰ علیہ السلام سے کافی پہلے کا ہے یعنی تقریباً ”انیس صدی قبل مسیح“۔

۲۔ صبر و ثبات، علم و امانۃ: بائبل کے مطابق یوسف علیہ السلام کی والدہ کا نام راحل بنت لابن (یا راحیل بنت لابان) تھا اور ان کے دوسرے بیٹے یوسف کے بھائی بن یحییٰ (یا بن یامین) تھے، دوسری بیویوں سے مزید دس بیٹے تھے۔ یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائی بن یحییٰ یعقوب علیہ السلام کے بست چیتے تھے، بالخصوص یوسف سے تو ان کو والدانہ محبت تھی اور ان کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھتے اور نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیتے۔ اس کا ظاہر سبب تو ان کا اعلیٰ و مثالی سیرت و کردار و اخلاقی اور فطری ذہانت و فراست تھا لیکن دو سراسبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کو وحی کے ذریعہ اشارہ مل گیا ہو کہ یہ بھی آئندہ چل کر منصب نبوت پر فائز ہونے والے ہیں۔ اس ترجیحی سلوک نے سوتیلے بھائیوں کے دل میں حسد و نفرت کے جذبات ابھارے۔ اسی دور ان یوسف علیہ السلام نے خواب دیکھا اور اس کو اپنے والد صاحب سے بیان کیا کہ: ”میں نے خواب میں دیکھا کہ گیارہ ستارے اور شمس و قمر مجھے سجدہ کر رہے ہیں“ (یوسف: ۴) والد صاحب نے فراستِ نبوت سے حقیقت حال کا اندازہ کیا اور بیٹے کو نصیحت فرمائی:

”اے میرے بیٹے! تم اس خواب کو اپنے بھائیوں کو نہ سنانا، ایسا نہ ہو وہ تمہارے ساتھ کچھ چال چلیں اور شیطان تو انسان کا احد دشمن ہے“ اسی سلسلہ میں آپ نے انہیں یہ خوش خبری بھی سنائی:

○ وکفنا لک بجنبک ربک بعلمک من تاویل الاحادیث..... علیم حکیم ○..... (یوسف: ۶)

ترجمہ: ”اور اس طرح تمہارا رب تمہیں برگزیدہ کرے گا اور تاویل احادیث سکھائے گا اور اپنی نعمت کو تم پر اور آل یعقوب پر پورا کرے گا جس طرح اس کو پہلے تمہارے اجداد پر پورا کیا (یعنی) ابراہیمؑ و اسحقؑ پر بیشک تمہارا رب علیم و حکیم ہے۔“

اس خواب نے والد کی شفقت میں اضافہ کیا تو سوتیلے بھائیوں کی آتشِ حسد و عناد مزید بھڑکی۔ یہاں تک کہ وہ اپنے بھائی کو ختم کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ ایک دن تفریح کے زمانے باپ سے اجازت لے کر یوسفؑ کو باہر لے گئے اور ایک اندھے کنوئیں میں پھینک دیا واپسی میں ان کی قیض کو کسی جانور کے خون سے آلودہ کر کے باپ کے سامنے لائے اور روتے ہوئے کہا کہ ”جب ہم دوڑتے ہوئے آگے نکل گئے تو انہیں بھیڑا کھا گیا.....“ (یوسف: ۱۷) یعقوب علیہ السلام نے سچ بہن دیکھ کر صحیح صورت حال کا اندازہ کر لیا، اس میں خون تو لگا تھا لیکن کہیں سے پشادھڑانہ تھا۔ نبیؑ تو خود ہی صبر و ثبات اور حلم و سہمت کا پیکر ہوتا ہے، اس شدید غم و غصہ کے عالم میں صرف اتنا ہی کہا:

○ قال ہل سولت لکم انفسکم امرا..... فصبر جمیل واللد المستعان علی ما تصفون ○..... (یوسف: ۱۸)

ترجمہ: ”(یعقوبؑ نے کہا) بلکہ بنا دی ہے تمہارے نفسوں نے تمہارے لیے ایک بات، اب صبر جمیل ہی بہتر ہے اور تم جو بات بتا رہے ہو اس پر میں اللہ ہی سے مدد مانگتا ہوں۔“

الغرض بھائیوں کی دغا بازی و کمزور فریب کے سبب یوسف علیہ السلام کو اواکل عمر سے ہی شدید تکالیف و مصائب کا سامنا کرنا پڑا، والدین کے

آنحوش شفقت سے محروم ہو کر اندھے کوئیں کے کرب و آلام میں مبتلا رہے پھر کسی قافلے نے انھیں نکالا اور مصر کے ایک مستند شہر میں غلام بنا کر بیچ دیا۔ ایک مصری افسر 'عزیز مصر' ان کو خرید لیتا ہے۔ اپنی پاکبازی، اعلیٰ اخلاق و کردار، سلیقہ مندی، وجاہت و وقار کے سبب آپ اس افسر کی آنکھ کا تارا اور دل کے مالک بن جاتے ہیں۔ وہ ایک بدوی کو حقارت سے دیکھنے کی بجائے اعزاز و اکرام اور محبت بھرے جذبات سے اپنے گھر کا فرد بنا لیتا ہے اور بیوی سے کہتا ہے:

○ انکرمی متواہ عسی ان ینفعنا او نتخذہ ولدا الخ..... (یوسف ۲۲)

ترجمہ: ”(دیکھنا) اس کو عزت سے رکھنا ممکن ہے یہ ہمارے لیے نفع بخش ہو یا ہم اسے بیٹا بنالیں.....“

اس طرح اوائل عمری کے مصائب و شدائد سے نکل کر بظاہر اعزاز و اکرام اور عیش و عشرت کے ماحول میں پہنچے لیکن یہ نئی اور بڑی آزمائش کی ابتداء ثابت ہوا۔ شفیق و کریم میزبان کی بیوی بد فطرت اور ہوائے نفس کی غلام تھی اس کی خواہش نفس اور ٹپاک عزائم کی تمیل سے انکار پر قید خانہ میں بھجوا دیے جاتے ہیں شفیق باپ اور عزیز بھائی کی جدائی کا احساس توقید و بند کی صعوبات میں اور بھی شدید ہوگا لیکن صابر باپ کے صابر بیٹے تمام مصائب و آلام کو خدا ان پیشانی پر داشت کرتے ہیں اور رب کی مرضی و مشیت پر پوری طرح صابر و شاکر رہتے ہیں۔ نہ تو ظالم و سفاک بھائیوں کے خلاف انتقامی جذبہ ابھرتا ہے اور نہ ہی حرف شکایت زبان پر آتا ہے۔ اوھر باپ ”صبر تمیل کی روش اختیار کرتے ہیں تو اوھر بیٹا اپنے معاملہ کو رب کریم کے حوالہ کر کے اس کی بددعا کا مظہر ہو جاتا ہے۔

۳۔ پاکر دار نو جوان کی مثالی تربیت: یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی اور مضبوط کردار بھی بلاشبہ قابل رشک ہے۔ اس بے دینی کے آزادانہ ماحول میں پروان چڑھنے والی جنس مخالف کے لیے یوسف علیہ السلام کی شخصیت جو بے پناہ حسن و جمال اور مردانہ وجاہت کی حامل ہے کس قدر پر کشش ہوگی اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ ساتھ ہی عزیز مصر کے گھر میں آپ کی پذیرائی اور اعتماد و جود کے تربیتی ماحول اور بے راہ روی کے لیے سازگار حالات نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا کس قدر ہمت شکن اور صبر آزمائے وہ لمحات جب دل کشی اور ہو شربائی کا تمام سامان جمع کر کے شیطان نے بھرپور وار کیا ”اس عورت نے دروازہ بند کر کے آپ کو بدکاری کی دعوت دی لیکن آپ نے عزم و ہمت کی چٹان بن کر اس دعوت کو رد فرمایا اور خود کو بخاری کی اس روایت کا مصداق ثابت کروایا۔

”سبعت یظلمہم اللہ فی ظلمہ یوم لا ظل الا ظلم..... ورجل نعتہ اسراءۃ ذات حسب و جمال فقال انی اخاف اللہ.....“

ترجمہ: ”سات آدمیوں کو اللہ اس روز اپنے سائے میں رکھے گا جس دن کوئی سایہ نہ ہوگا سوائے اس کے سائے کے..... ان

ساتھ میں وہ شخص بھی ہوگا جسے حسب و جمال والی عورت اپنی طرف بلائے اور وہ کہے کہ میں تو اللہ سے ڈرتا ہوں.....“

غور فرمائیے کہ یوسف ”انی اخاف اللہ“ کے جس جوہری ہتھیار سے آراستہ تھے ”اس شیطانی ماحول کی پروردہ وہ عورت اس سے یکسر محروم تھی۔ ایہ واقعہ تزکیہ نفس و تقویٰ کا ذوق رکھنے والے پاکر دار جوانوں کے لیے اعلیٰ اور مثالی نمونہ ہے، لیکن جنسی بے راہ روی کے شائقین نے اسے رومانی و افسانوی رنگ دے دیا، اور ”قصہ یوسف و زلیخا“ کے نام پر جھوٹے اور من گھڑت واقعات سے لبریز بازاری کتابیں شائع کر کے لوگوں کی آوارگی و گمراہی کے لیے گند امواد فراہم کر دیا، کیسی توہین کی ہے انہوں نے نہ صرف اللہ کے رسول کی اور کتاب اللہ کی آیات کی!۔ یہ قرآنی سے کہیے بے خوف ہیں۔ حتم بالائے حتم ملاحظہ ہو یہاں تک مشہور کر دیا گیا کہ یوسف علیہ السلام نے اس عورت کو ”معجزات“ سے دوبارہ جوان کر کے اس سے شادی کی!۔ کس قدر بے بنیاد من گھڑت بات ہے جو نہ قرآن و حدیث میں ہے اور نہ اسرائیلی روایات میں۔ ایک نبی کے یہ نمایاں شان نہیں کہ وہ ایک بد کردار عورت سے نکاح کرے۔ قرآن نے یہ قاعدہ کلیہ اس طرح بیان فرمایا ہے:

○ الخبیث للخبیث والخبیث للخبیث والطیبت للطیبین والطیبون للطیبات (النور- ۲۶)

ترجمہ: خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لیے ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لیے۔ پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لیے

ہیں اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لیے۔"

انبیاء علیہم السلام سے ایسے واقعات منسوب کرنا ذوال پذیر حاصل کتاب قوموں کے اہلکار و رہبان کا وظیفہ رہا ہے جو آخرت سے بے خوف ہو کر کتاب اللہ کا مذاق اڑانے اور انبیاء کی توہین کرنے میں بے حد جری اور بے باک ہو جاتے ہیں "العیاذ باللہ! اللہ تعالیٰ نے عام مومنوں کے ترکیہ نفس کے لیے "نفس بصر" اور "حفظ فرج" کے سخت قوانین نافذ فرمائے ہیں چنانچہ سورۃ النور میں فرمایا:

○ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِينَ بَغَضُوا مِنْ ابْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ (النور: ۳۰)

ترجمہ: "مومنوں سے کہو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور شرم گاہوں کی حفاظت کریں یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزگی ہے۔"

اسی طرح کا حکم مومنہ خواتین کے لیے بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نظر میں ترکیہ نفس کرنے والے ہی فلاح یاب ہیں چنانچہ فرمایا "قَدْ افْلَحَ مَنْ تَزَكَّى" (فلاح پا گیا جس نے ترکیہ کیا۔ سورۃ اعلیٰ) اور قَدْ افْلَحَ مَنْ ذَكَرَ (سورۃ الشمس)۔ اور انجام کار کی کامیابی و کامرانی تو ان ہی کے لیے ہے جو رب کی عدالت میں کھڑے ہونے سے خوفزدہ ہو کر اپنے آپ کو خواہشات نفسانی کی سرکشی سے بچائے رکھیں چنانچہ فرمایا:

○ وَاِمِنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ (التغذات: ۳۹-۴۰)

ترجمہ: "اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا اور نفس کو بری خواہشات سے باز رکھا تو جنت اس کا ٹھکانہ ہوگی۔"

اس کے برعکس جو نفس کی غلامی اختیار کریں اور اسی کے تقاضے پورے کرنے میں لگے رہیں تو ایسے ہی لوگ خائب و خاسر ہیں۔

○ اَوْعَيْتَ مِنْ اتَّخَذَ الْهَوَاهُ (فرقان: ۴۳)

ترجمہ: کیا تم نے اس شخص کے حال پر غور کیا جس نے اپنی خواہش نفس کو ہی بنا لیا۔

یوسف علیہ السلام تو نبوت کی اہم ذمہ داری کے لیے منتخب کئے گئے تھے ان کے اندر تو وہ تمام اوصاف بدرجہ اتم موجود تھے جو صالح ترین افراد میں متوقع ہوں۔ کسی کا ان کے بارے میں یہ گمان رکھنا کہ وہ ایسے کردار کی حامل عورت کے لیے جس کا مختصر مگر جامع خاکہ قرآن نے پیش کر دیا ہے "اپنے دل میں سوائے نفرت و بیزاری کے کوئی مقام رکھتے تھے" سفیانہ انداز فکر کی انتہا ہوگی۔ البتہ عظیم و حکیم رب نے ان کو جن شدید ترین آزمائشوں سے دوچار کیا۔ یہ ان کی تربیت کے مختلف مراحل تھے تاکہ ان کے صبر و ضبط کی خفیہ صلاحیتیں پوری طرح بیدار ہو کر شعوری طور پر بروئے کار آئیں 'بڑی سے بڑی اذیت و صعوبت اپنے رب پر ان کے یقین و توکل کو پختہ سے پختہ تر کرتی چلی جائے اور کبھی بھی یاسیت اور خوف و ہراس کا شائبہ بھی قریب نہ آئے پائے۔ ہر آنے والی شدید سے شدید آزمائش ان کے ایمان و یقین کی شان کو دوبالا کر دے۔ اور بالاخر ان آزمائشی مراحل سے گزرنے کے بعد ان کی شخصیت میں اعلیٰ ترین اوصاف اور بلند پایہ عزم و اعتماد کا حامل وہ مثالی کردار ابھر کر آئے جو ان کو دیکھنے والوں کی آنکھ کا تار بنا دے اور وہ بغیر کسی پس و پیش کے ان کو اعلیٰ ترین منصب کے لئے قبول کر لیں۔

اب یہ بھی امر واقعہ ہے کہ ربانی منصوبہ اور فیصلہ ہمارے سامنے حالات و واقعات کے روپ میں ہی آتا ہے۔ حیات یوسف کے واقعات پر غور کرنے سے منصوبہ رب کی کار فرمائی کا ایک تسلسل عیاں ہوتا ہے۔ برادران یوسف اپنے مفاد اور تقاضے نفس کے تحت بھائی کو راستہ سے ہٹانے کے لئے اندھے کنوئیں میں ڈال کر اپنا مشن پورا کر لیتے ہیں۔ لیکن منصوبہ الہی کچھ اور ہے۔ قافلہ والے انہیں وہاں سے نکال کر غلام کی حیثیت سے فروخت کر دیتے ہیں۔ عزیز مصر کے ہاں ایسی پذیرائی ہوتی ہے کہ یکایک غلامی سے آقا کی کا درجہ مل جاتا ہے۔ لیکن زندگی بیکار یہ موڑ ایک بڑی آزمائش کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔ جیسی بے راہ روی کے لئے سازگار ماحول تو عابد و زاہد کو بھی رب سے دور اور شیطان سے قریب کر دیتا ہے 'لیکن اللہ تعالیٰ جس کو اپنے "برہان" کا شعور عطا فرمادے وہ یکسو مومن و مجاہد احسان کی روشنی پر پوری طرح جما ہوا اور اپنے نفس پر کڑی نظر رکھتا ہو "اس نفس پر جو" "امارۃ بالسوء" (یعنی برائی کی طرف اکسانے والا ہے) وہ ایسی آزمائش و

اتلا میں اپنے رب سے اور بھی قریب ہو جاتا ہے اور شیطان کا وار ایسے "مخلصین" کا کر نہیں ہو کر تا بلکہ ان کے کردار میں مزید نکھار پیدا ہو جاتا ہے یہ آزمائش ان کے تزکیہ اور طہارت نفس کو عروج و گدگد پہنچانے کا ہے۔ جس کا مقصد ہے جیسا کہ قرآن میں فرمایا:

كُنَّا لَكَ لَبِصْرًا مُّصَوِّدًا وَاَنْعَمْنَا لَكَ الْآيَاتِ لِيَاذُنَ الْغَافِلِينَ (سورہ النحل: ۲۳)

ترجمہ: "ایسا (اس لیے) ہوا تاکہ ہم اس سے برائی اور بے حالی کو دور کریں۔ بے شک وہ ہمارے بچے ہوئے بندوں میں سے تھا۔" واضح ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کے پیش نظر ان کے تزکیہ نفس اور تربیت کا ایک ہم مقصد تھا جس کے حصول کے لیے یہ سفر مکہ ان مراحل سے گزر رہا ضروری تھا بالخصوص مصر کے اس معاشرے میں جو اخلاقی انحطاط کا بری طرح شکار تھا۔ لوگ بد کردار، ناشی اور بے ایمان تھے اور پھر بھی اپنے آپ کو مذہب و متمدن سمجھتے تھے۔ یاد رکھیں کہ یہاں پر دیکھا ہوئے کے باوجود احساس زیادہ سے محروم تھے۔ اس معاشرے میں یوسف علیہ السلام سے اخلاقی اصلاحی کام لینے کے لیے ابھی ایک مرحلہ باقی رہ گیا تھا اس مشن کی تکمیل کے لیے ان کو مصر تک پہنچانا ضروری سمجھا گیا۔ چنانچہ اس کا اہل ثابت کرنے کے لیے ضروری تھا کہ انہوں کی نظر میں ان کی شخصیت قطعاً بے دوغ و ثابت کردی جائے تاکہ شیطانی منصوبے کے تحت غلط اور بے بنیاد پروپیگنڈے اور ہر قسم کی مغالطہ آرائی کا پردہ چاک کر کے آپ کے کردار کو شیعہ کی طرح شفاف کر دکھایا جائے۔ ایک انحطاط پذیر معاشرے کے دھارے کا رخ موڑنے والے کو معاشرے کی پستیوں سے بلند و بالا بنی ہونا چاہیے۔ چنانچہ مشیت الہی نے حالات کا رخ اس ٹھکانہ انداز سے موڑا کہ عقل انسانی رنگ رہ جاتی ہے۔ اس نام نہاد مذہب و متمدن معاشرے میں جو جنسی آزادی اور بے راہ روی کی نجاست سے بری طرح آلودہ تھا جہاں ایک فریضہ خصلت و با کردار انسان کو پھانسنے کے لیے ہر طرف خوبصورت و پرکشش جال پھیلے ہوئے تھے اور ضبط نفس کی بندش میں معمولی ذہیل اور ذرا سی لغزش شیطان لعین کو کامیابی سے ہمکنار کر سکتی تھی لیکن حکیم و خیر رب نے شیطان کی چال اسی پر الٹ دی۔ عزیز مصر کی عورت جو اب تک الفت و محبت سے سرشار ہو کر یوسف پر عنایات و نوازشات کی بارش کر رہی تھی اپنی ہوس رانی کی شیطانی کوشش میں ناکامی و پشیمانی کے بعد یکایک تیور بدل لیتی ہے اور غیظ و نقصہ کے عالم میں یوسف علیہ السلام پر خیانت و بد کرداری کا الزام قیوب دیتی ہے۔ اللہ اور یوم آخرت سے بے خوف انسان کا شیطانی روپ کس قدر حیرت انگیز اور غیر متوقع ہوتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ بھی جلد ہی انتقام لے لیتا ہے۔ عزیز مصر کی موبہ دگی میں اسی غافلانہ کا ایک فرد یعنی شہادت کی عدم موجودگی میں قرینہ کی شہادت پر فیصلہ دے کر اس عورت کی عیاری کا پردہ فاش کر دیتا ہے قرآن کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

○ لَمَّا دَانَ الْمَسْرِ... لَمَّا دَانَ الْمَسْرِ كَذَبَ كُنْ... ان كَذَبَ كُنْ عَظِيمٌ ○ (یوسف: ۲۸)

ترجمہ: "پھر جب اس کا کرتہ بچھے سے پھنسا ہوا دیکھا تو اس نے کہا یہ تم عورتوں کی چال ہے اور بلاشبہ تمہاری چالیں زبردست ہوتی ہیں۔"

عزیز مصر نے رسوائی کے خوف سے بات ختم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن بات چھی کیسی رہتی!۔ ایسے معاشرے میں تو ایسے معاملے کو خوب اچھالا جاتا ہے کیونکہ یہ لذت نفس اور عوامی دلچسپی کا باعث ہوتا ہے۔ اعلیٰ طبقہ کی عورتوں میں اس کا چرچا ہوا اور عزیز مصر کی عورت کو بے حیائی اور بے ہمتی معیار کے طعنے ملنے لگے کہ اپنے غلام سے ہی میلان طبع رکھتی ہے۔ اس عورت نے جب یہ سنا تو اپنے دفاع کا اہتمام کیا۔ شیطانی خصلت کا حامل اپنا دفاع بھی شیطانی انداز سے ہی کرتا ہے۔ ہوسے پانے پر ہر تکلف سیافیت میں ان خواہش کو مدعو کیا گیا اور عین انہماک کے عالم میں یوسف کو باہر نکالا گیا عورتیں یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر دنگ رہ گئیں اور حیرت و استعجاب کی شدت میں انہوں نے اشیائے طعام کاٹنے کی بجائے چھریوں سے اپنے ہاتھ کاٹ لیے! قرآن نے اس کی منظر کشی کی ہے:

○ وقطعن ايديهن قلن حاش لله ما هذا بشرا ۛ ان هذا الاصلك كريم ○ (يوسف: ۲۱)

ترجمہ: ”بھر جب عورتوں نے اس کو دیکھا تو دنگ رہ گئیں اور انھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے اور کہا حاشا للہ! یہ آدمی نہیں یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے۔“

عزیز مصر کی بیوی اپنی کامیابی پر بے حد مسرور ہوئی اور ان عورتوں کو طغ و استغراء کا نشانہ بناتے ہوئے ٹکڑے ٹکڑے کے ساتھ اس عزم کا اظہار کیا کہ اگر اس نے میرا کمانہ مانا تو اس کو قید خانہ جانا پڑے گا اور رسوائی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ حیات یوسف کا اب نیا موڑ سامنے تھا۔ نفس پرستوں کے اس نجس شیطانی ماحول میں ایک پاکیزہ سیرت و حسن کے بندے کی امتیازی شان بھی بھید قابل رشک نمود ہے۔ صبر و عزم کے ساتھ ان مراحل سے گزرتے ہوئے اپنی ثابت قدمی و پاکبازی پر کسی قسم کے تکبر اور خود ستائی کا ذرا سا بھی شائبہ ہونا تو دور کی بات ہے یہاں تو مجزوا انکساری کا یہ عالم ہے کہ اپنی بشری کمزوریوں کا احساس کر کے ہی کانپ اٹھتے ہیں اور پورے اخلاص و اعتماد کے ساتھ اپنے رب کی طرف رجوع کرتے ہوئے التجاء کرتے ہیں:

○ قال رب السجن احب الي مما يدعونني اليه ۛ هو السميع العليم ○ (يوسف: ۳۳، ۳۴)

ترجمہ: ”(یوسف نے) کہا اے میرے رب! قید خانہ مجھ کو اس چیز سے زیادہ پسند ہے جس کی طرف یہ مجھے بلا رہی ہیں۔ اور اگر تو نے ان کے فریب کو مجھ سے دفع نہ کیا تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور جاہلوں میں سے ہو جاؤں گا۔ پس اس کے رب نے اس کی دعا قبول کر لی اور ان کے فریب کو اس سے دفع کر دیا بے شک وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔“

ذرا غور فرمائیے، کیسا عجیب تضاد ہے یہ! ایک طرف یوم حساب اور رب کے عذاب سے ڈرنے والا نیک سیرت مرد مجاہد ہے جو ہر قسم کے اعلیٰ مناصب عیش و طرب کی بے پناہ ترغیبات اور خواہش نفس کی تسکین کے تمام سامان کو صرف اور صرف اپنے رب کی نافرمانی سے بچنے کی خاطر ٹھکرا دیتا ہے اور اس کے مقابلہ میں ”رب السجن احب الی.....“ کہہ کر صعوبت زنداں برداشت کرنے کو رضا و رغبت آمادہ ہو جاتا ہے! یہ بلاشبہ تسلیم و رضا اور عزیمت و استقامت کا ایک مثالی نمونہ ہے دو سری طرف ”مہذب و مستدن“ معاشرے کا بااثر فرد اور اقتدار و وقت کا بڑا افسر عزیز مصر اپنے آپ کو اور اپنی بدکردار فاحشہ بیوی کو بدنامی و رسوائی سے بچانے کی خاطر ایک معصوم اور بے خطا اعلیٰ ظرف اور اعلیٰ اخلاق کے حامل پاک طینت و پاکیزہ سیرت ہونمار تو جوان کو خطا کار مجرموں کے ساتھ قید میں ڈال دینے میں نہ صرف اپنے اور خاندان کے لیے بلکہ معاشرے کی اعلیٰ طبقہ کی عورتوں کے لیے بھی عافیت سمجھتا ہے! آخرت سے بے خوفی نے نفس پرست انسان کو عدل و انصاف اور اخلاقی قدروں اور حیاء و غیرت سے کیسا بے نیاز کر دیا ہے!

۳۔ حکیم و دانا مبلغ الغرض، یہ یوسف علیہ السلام جیسے اولوالعزم اور مجاہد صفت انسان ہی کی شان عزیمت ہے کہ اپنے حقیقی کار ساز رب پر توکل کے سارے معاشرے کی پستیوں سے اوپر اٹھ کر ”صبر و عزم اور قلب مطمئن“ کے ساتھ آزمائش کے اس نئے مرحلہ میں قدم ڈالتے ہیں، اور پورے شعور و حوصلہ کے ساتھ اپنے رب کی مشیت سے ہم آہنگ ہو کر زنداں کی تکھیاں اور صعوبتیں خوش دلی کے ساتھ برداشت کرتے ہیں۔ انسانی محبت، ہمدردی اور درمندی جو آپ کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، یہاں کے سازگار ماحول میں اور زیادہ نمایاں ہو گئی یہاں معاشرے کے مظلوم اور پس ماندہ طبقہ سے سابقہ پڑا تو آپ کے خلوص، شفقت، حسن سلوک اور اجتماعی صلاحیتوں نے آپ کو قیدیوں کی آنکھ کا تارا بنا دیا اور اعلیٰ مومنانہ اوصاف، زہد و تقویٰ اور عبادت و ریاضت سے لوگوں کے دلوں میں عزت و احترام کا امتیازی مقام پیدا ہوا اور تورات میں تو یہاں تک آیا ہے کہ وارنڈہ زنداں بھی آپ سے متاثر ہو گئے تھے۔ چنانچہ خواب کی تعبیر معلوم کرتے ہوئے قیدی ساتھیوں نے آپ کی عظمت اور نیک نفسی کا جو اعتراف کیا اس کو قرآن بیان کرتا ہے:

○ نبشاناويله ج النبراك من المحسنين ○ (یوسف: ۳۶)

۳۶: ”آپ ہمیں اس کی تاویل بتائیں ہم آپ کو (امت ہی) نیک پاتے ہیں۔“

یہ عقیدت و احترام کا ماحول دعوت و تبلیغ کے لیے یقیناً بہت ہی سازگار تھا وہاں تو ہر شخص اس بات کا منتظر ہو گا کہ آپ لب کشائی فرمائیں اور لوگ ہمد تن گوش ہو کر آپ کی بات سنیں پھر آپ تو نبی کے بیٹے اور خود نبی بننے والے تھے، دعوت حق کا ذوق تو آپ کے ریشہ ریشہ میں پیوست تھا اور یہ مشن آپ کی زندگی کا نصب العین تھا، پھر آپ دعوت کا کوئی بھی مناسب موقع کیسے ہاتھ سے جانے دیتے۔ قرآن میں یوسف علیہ السلام کی جامع اور بھرپور زبانی تبلیغ صرف ایک ہی موقع پر مذکور ہے تاہم ممکن ہے کہ وقتاً فوقتاً مناسب مواقع پر جزوی و عطا و نصیحت فرماتے رہے ہوں یا بھرپور دعوت کے لیے مناسب موقع کی تلاش میں قید خانے کے چند سال گزار دیے ہوں۔ ہر نوع یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ صحیح اور سچے مومنین کی جو بلاشبہ داعی حق ہوتا ہے، صرف زبان ہی دعوت دین نہیں دیتی بلکہ اس کا تو ایک ایک عمل تبلیغ و دعوت حق میں اپنا کردار ادا کرتا ہے، خواہ وہ زنداں میں ہو یا اور کہیں۔ بندگی و تقویٰ کے رنگ میں رنگے ہوئے مومنین کے شب و روز تو پوری طرح اللہ تعالیٰ کے احکامات کے مطابق ہی گزرتے ہیں اور یہ خاموش و دعوت کا موثر انداز ہے کیونکہ احکامات الہی پر عمل کرنا اور کرانا ہی مقصود و مطلوب ہوتا ہے۔ لہذا کوئی شخص اگر زبان نہ کھولے لیکن عملی طور پر دعوت دین کو پوری طرح لوگوں کے سامنے ظاہر کر دے تو گویا اس نے اپنا کام کر دیا اور تبلیغ کا کسی قدر حق بہر حال ادا کر دیا۔ اس لحاظ سے یوسف علیہ السلام تو ہوش سنبھالتے ہی عملی تبلیغ میں مصروف ہو گئے تھے آپ کی راست بازی، امانت و دیانت، حسن اخلاق، تقویٰ و پرہیزگاری نے لوگوں میں خاص اثر کیا تھا اور اصحاب ائین اور داروفا جن کا احترام اور مودت سلوک اس کا بھین ثبوت ہے۔ یوسف علیہ السلام غیر معمولی عقل و دانش اور فراست سے نوازے گئے تھے وہ خوب سمجھتے تھے کہ قبولیت کی استعداد پیدا کیے بغیر تبلیغ کرنا گویا بل چلائے اور زمین ہموار کئے بغیر سچ بھینکنا ہے جنہیں چڑیاں چک جائیں گی۔ درج بالا سطور سے یہ امر واضح ہے کہ زندان کے چند سالوں میں وہ اتنے ہر و عمر ہو چکے ہیں کہ نہ صرف قیدیوں بلکہ اہلکاروں کے قلوب بھی آپ کی دعوت کے لیے گوش بر آواز ہیں اور آپ کی لب کشائی کے منتظر چنانچہ اللہ تعالیٰ نے موزوں ترین حالات میں موقع عنایت فرمایا تو آپ نے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ یہ واقعہ اس طرح ہوا کہ زندان میں آپ کے ساتھ دو اور نو جوان قید ہو کر آئے تھے: ”وَدَخَلَ مَعَهُ السَّجْنُ ۚ (یوسف: ۳۶)۔ ان میں سے ایک فرعون مصر کا ساتھی تھا اور دوسرا داروفا تھا۔ انہوں نے قید خانے میں خواب دیکھا اور اپنے خوابوں کو یوسف علیہ السلام کی خدمت میں تعبیر حاصل کرنے کے لیے پیش کیا یوسف علیہ السلام نے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کو موثر انداز میں دعوت دی لیکن ابتداءً شفقت سے کہنا:

”یہاں تمہیں جو کھانا ملتا ہے اس کے آنے سے پہلے میں تمہیں ان خوابوں کی تعبیر بتا دوں گا یہ بھی اس علم میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے عطا فرمایا ہے۔ وراصل میں نے ان لوگوں کے مذہب کو چھوڑ دیا ہے جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور وہ آخرت کے منکر ہیں۔ اور میں نے اپنے بزرگوں، ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کے مذہب کی پیروی اختیار کی ہے تمہارا یہ کام نہیں کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں۔ (در حقیقت) یہ اللہ کا فضل ہے ہم پر اور تمام انسانوں پر کہ اس نے اپنے سوا کسی اور کی بندگی کا بوجھ نہیں ڈالا) مگر اب لوگ شکر نہیں کرتے“ (یوسف: ۳۸)

اس موثر و دلنشین تمیز کے ذریعہ لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول و مرکوز کر کے وہ عظیم الشان خطبہ دیا ہے جو بلاشبہ دعوت قرآن کی روح اور تمام انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا مرکز و محور رہا ہے ملاحظہ ہو:

○ یصاحبی السجن ارباب متفرقون خیر ام اللہ الواحد القہار ○ ماتبعون من دونه الاسماء سمعواھا انتم و اباؤہم

کم ما نزل الله بها من سلطان ۛ ان الحكم الا الله ۛ امرا لا تعبدوا الا الله ۛ فאלک اللین القیم ولكن اکثر الناس لا یعلمون (.....) (یوسف: ۳۹، ۴۰)

اے خداؤں کے ساتھیو! (ذرا سوچو تو سہی) بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا اللہ اکیلا جو سب پر غالب ہے؟ تم اس کے سوا جن جن کو پوج رہے ہو وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ محض چند نام جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ لیے ہیں اللہ نے تو اس کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی۔ فرمانروائی و اقتدار صرف اللہ ہی کے لیے ہے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی دینِ قیم (صحیح اور سیدھا دین) ہے مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔

اس صورتحال پر کچھ تبصرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جس ذہانت و فراست سے یوسف علیہ السلام نے اس موقع سے دعوتی کام کے لیے فائدہ اٹھایا وہ لائقِ تحسین بھی ہے اور قابلِ غور بھی۔ اصحابِ الہمن کے عقیدہ مندانہ ماحول میں دو نوجوان قیدی تعبیرِ خواب کے لیے بڑے ادب و احترام کے جذبہ کے ساتھ آپ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اب اگر ان کو فوراً ہی خواب کی تعبیر بتادی جاتی تو بات سننے کا شوق، ذہنی تجسس اور دلچسپی کی وہ کیفیت باقی نہ رہتی اور پھر تقریر پر اتنی توجہ نہ دی جاتی۔ اس اہم نفسیاتی پہلو کو مد نظر رکھتے ہوئے تعبیرِ خواب کی بات کو کچھ موخر کرنا ضروری سمجھا گیا لیکن اس کے بعد اگر ابتدائی کلمات کے بغیر ”بصاحبی السجن....“ کے ساتھ ہی دعوت و تبلیغ کا ایک شروع کر دی جاتی تو لوگ جلد ہی اکتا جاتے کہ اصل موضوع سے ہٹ کر یہ کیا بات شروع کر دی گئی! لہذا نہایت ہی حکیمانہ انداز میں درمیان کی راہ اختیار کی گئی۔ پہلے لوگوں کو یہ واضح کیا گیا کہ تعبیرِ خواب کا علم میرے رب کی عنایت و نوازش سے عطا ہوا ہے اللہ تعالیٰ کے احسانات اس انداز سے ذکر فرمائے کہ توحید باری تعالیٰ پر بات کرنے کی راہ نکالی پھر خوبصورت استدلال کے ساتھ دین کے اہم مسئلہ کو اجاگر کرنے سے پہلے سوچی ہوئی قوم کی دکھتی رگوں پر نشتر زنی کر کے ماحول کو جھنجھوڑا، دیگر انبیاء کی سنت کی پیروی کرتے ہوئے ان کو بتایا کہ میں کوئی نئی، انسانی بات نہیں کر رہا اور نہ ہی نیا اور نرالا دین پیش کر رہا ہوں بلکہ کائنات کی اس ازلی وابدی حقیقت کی طرف بلا رہا ہوں جس کی طرف اس سے پہلے تمام انبیاء، ابراہیم، اعلیٰ و یتھوب علیہم السلام بلا تے رہے ہیں۔ قرآن نے اس کو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا ہے تاکہ اس مشن کو لے کر اٹھنے والے اس سے دعوت و تبلیغ کی حکمت و موعظت کا اندازہ لے سکیں جو شخص اپنی توانائیوں اور صلاحیتوں کو اس مشن کے لیے وقف کرنے کا عزم کر چکا ہو اور اس کے ساتھ ہی ذہانت و فراست اور حکمت تبلیغ سے بھی نوازا گیا ہو وہ موقع کی تلاش میں رہتا ہے اور مناسب موقع ملنے پر اللہ کی تائید و توفیق سے نہایت خوبصورتی و شائستگی کے ساتھ گفتگو کا رخ دعوتِ حق کی طرف پھیر لیتا ہے۔ اس کے برعکس جس کی نظر میں اس کام کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو اس کے سامنے تو مواقع پر مواقع آتے ہیں لیکن وہ کبھی محسوس ہی نہیں کرتا کہ اب بات کرنے کا موقع ہے لب کشائی کی جائے۔ البتہ بہت بڑا فرق ہے ایک ذکی و حکیم کی موقع شناسی اور بر محل دعوت میں اور اس نادان مبلغ کی بے ٹکی تبلیغ میں جو موقع و محل کا لحاظ کئے بغیر ہی لوگوں کے کانوں میں زبردستی اپنی دعوت ٹھونسے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے بھونڈے اور تند و تیز جذباتی انداز کی وجہ سے لوگوں کو حق کی طرف مائل و راغب کرنے کی بجائے متفرق و بیزار کر دیتا ہے۔

جیسا کہ درج بالا سطور میں عرض کیا گیا یہ تقریر دعوتِ قرآن کی گویا روح ہے اور بلاشبہ توحید پر امتحانی جامعہ و موثر خلیفہ ہے جو امتحانی سادہ مگر پر کار ہے اور حکمت و دانش سے بھرپور۔ اس پر غور کرنے سے ایک اہم پہلو یہ سامنے آتا ہے کہ لوگوں کے سامنے دعوت کس انداز سے پیش کی جائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام قواعد و ضوابط کی بحث یا معاشرتی و سیاسی ہکاڑے کے اسباب و نقصانات کی تفصیلات میں جانے کی بجائے ان کے سامنے دین کے اس بنیادی اور اہم مسئلہ کو ہی پیش کرتے ہیں جو

انبیاء کی دعوت کا مرکز و محور اور نقطہ آغاز رہا ہے اور فی الحقیقت ہمیں سے اہل حق کا راست باطل، ستوں کے راست سے جدا ہونا ہے، یعنی توحید باری تعالیٰ اور شرک باللہ کا امتیازی فرق، پھر توحید و شرک کے اس فرق کی ایسے معقول و عام فہم طریقے سے وضاحت فرماتے ہیں کہ معمولی عقل و دانش والا شخص بھی اسے محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے، بالخصوص ان کے اس وقت کے مخالفین جو مازست پیشہ تھے یا غلام، ان کے تو قلب و ذہن نے اس بات کو با آسانی قبول کر لیا ہو گا، ان سے زیادہ اس بات کو کون محسوس کر سکتا تھا کہ ایک آقا کا غلام ہونا بہتر ہے یا بہت سے آقاؤں کا، اور پھر سارے جہاں کے اکیلے آقا کی بندگی آسان و بہتر ہے یا اس کے بندوں کی بندگی۔ کتنی سادہ اور پرکار تھی یہ دعوت!۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ یوسف علیہ السلام نے ان سے یہ تقاضا بھی نہیں کیا کہ تم اپنا دین چھوڑ کر میرا دین اختیار کرلو، بلکہ استثنائی دسوزی کے ساتھ مشفقانہ انداز میں ان کو سمجھاتے ہیں کہ دیکھو! یہ اللہ کا ہمارے اوپر کتنا بڑا فضل و کرم ہے کہ اس نے ہمیں اپنے سوا کسی اور کی بندگی کا پابند نہیں بنایا، مگر لوگ اللہ کے اس احسان کو نہیں سمجھتے اور اس کا شکر ادا نہیں کرتے بلکہ خواہ مخواہ اس کے بندوں کو اپنے ذہن سے گھڑ گھڑ کے اپنا رب بناتے ہیں اور ان کی بندگی کرتے ہیں!۔ لوگوں کے عقیدے اور آبائی دین پر تنقید کا انداز بھی بے حد معقول و شائستہ ہے اور ہر قسم کی دل آزاری سے پاک، صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ تمہارے یہ معبود جن کو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے (اللہ کے صفاتی ناموں اور) ان القابات سے نوازا دیا ہے (و اما غوث منج بخش و مشکل کشا بگزی بنانے والا، بیرون پار لگانے والا وغیرہ) یہ تو محض خالی غولی نام ہیں جو تمہارے باپ دادا نے گھڑ لئے ہیں، ان کا حقیقت نفس الامر سے کوئی تعلق ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے کوئی سند جو از فراہم کی ہے۔ اصل مالک اور مقتدر، حاکم اعلیٰ اور فرمانروا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہے (جسے تم بھی خالق و رب تسلیم کرتے ہو) اور اس نے (اس کائنات کی تخلیق کے بعد) فرمانروائی اور تدبیر امر کے تمام حقوق و اختیارات اپنے لیے مخصوص کر رکھے ہیں (کسی کو اپنا شریک کار نہیں بنایا) اور اس کا یہ حکم ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو، یعنی صرف اسی کے آگے سر جھکاؤ، جب بھی مانگو صرف اسی سے مانگو، اسی سے امیدیں رکھو، اسی سے خوف کھاؤ، شکرگزاری (نذر و نیاز) صرف اسی کی ہو، الغرض اسی کو اپنا سب کچھ جانو اور مانو اور ہر طرح اسی سے لو لگاؤ۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کے ذریعے جہاں حکمت و دعوت و تبلیغ کا جوہری انداز سکھایا وہاں اپنے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کے سامنے یہ حقیقت بھی کھول کر رکھ دی آج ہمیں ہمارے نبی کے ذریعے جو دعوت دی جا رہی ہے، بالکل یہی دعوت ہمارے برگزیدہ نبی یوسفؑ نے اپنے ساتھیوں کو دی اور وہ بھی اسی دین ابراہیمی کا پیروکار تھا جس کا شیع ہمارا یہ پیغمبر ہے۔

۵۔ ذکی و معاملہ فہم معجزہ الغرض، رشد و ہدایت کا یہ پیغام دینے کے بعد یوسف علیہ السلام نے خواب کی تعبیر کی طرف توجہ فرمائی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو بحیثیت نبی جو علم و حکمت عطا فرمائی تھی اس میں تاویل الہیہ اور تعبیر رویہ کا علم بھی شامل تھا، چنانچہ قرآن میں اشارہ فرمایا:

○ وَكُنَّا لَكَ بِحَبِيبِكَ رِيكٌ وَبِعِلْمِكَ سَنَ تَاوِيلَ الْأَحَادِيثِ..... (یوسف: ۶)

ترجمہ: ”اور اسی طرح تمہارا رب تمہیں منتخب کرے گا اور تم کو تاویل حدیث کا علم عطا فرمائے گا۔“

اس کے علاوہ وہ سری آیات میں بھی خصوصیت کے ساتھ اس کا ذکر کیا گیا ہے (ملاحظہ ہو آیت ۳۱، ۳۲، ۳۳) البتہ علم و

حکمت کے بارے میں فرمایا:

○ وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا ۚ وَكُنَّا لَكَ بِعِزِّ الْحُسَيْنِ ○..... (یوسف: ۳۳)

ترجمہ: "اور جب وہ اپنی پوری جوانی کو پہنچا تو ہم نے اس کو حکم و علم عطا فرمایا۔"

یہ "علم" اور "حکم" ہر نبی کو بحیثیت نبی اس کے مرتبہ حالات اور ذمہ داری کے دائرہ کار کے لحاظ سے عطا فرمایا جاتا ہے (مثلاً "اور دو سلیمان علیہما السلام اور دیگر انبیاء علیہم السلام) اور قرآن میں مختلف انبیاء کی بعثت کے سلسلے میں متعدد مقامات پر اس کا ذکر ملتا ہے۔ علم کی طرح حکم بھی وسیع المعنی ہے لیکن "حکم"۔ (حکم۔ حکم) حکم دینے یا فیصلہ کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جبکہ "حکم"۔ (حکم۔ حکمت) عقل و دانش، دور اندیشی یا اقتدار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ علم نبوت، مسائل و معاملات کا وہ خاص علم ہے جو انبیاء کو براہ راست مذربودہ عطا فرمایا جاتا ہے۔ اسی طرح تامل والا، ہیئت کا علم جس میں تعبیر، رہنما بھی شامل ہے اور یہ صلاحیت بھی کہ معاملات کے عوامل و عواقب اور نتائج کی طرح ایک دوسرے سے مربوط کر کے صحیح اور فیصلہ کن نتیجہ اخذ کر لینا، وقت کے نبی ہی کو عطا کیا جاتا ہے کیونکہ ان کا تعلق کسی حد تک فیہی امور سے ہی ہے اس لیے وحی سے رہنمائی کی روشنی میں اللہ کا نبی ہی ان علوم اور صلاحیتوں سے بقدر ضرورت نوازا جاتا ہے کوئی اور نہیں، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ خواب کی تعبیر بتانے سے پہلے یوسف علیہ السلام اس بات کی وضاحت فرماتے ہیں۔

○ فَالْكَامَا عَلَمْنِي رُبِّي..... (یوسف ۷۳)

یعنی (میں کوئی پیشہ ور کاہن یا منجم نہیں بلکہ) یہ بات میں تمہیں اس علم کے ذریعہ بتا رہا ہوں جو میرے رب نے مجھے عطا فرمایا ہے میرے علم و آگہی کا منبع و سرچشمہ تو وحی الہی ہی ہے۔

سورۃ یوسف میں چار خوابوں کا ذکر کیا گیا ہے "ان میں پہلا خواب خود یوسف علیہ السلام کا تھا جس سے قصہ کی ابتداء ہوتی ہے اور دو خواب ان دو قیدی نو جوانوں کے "ان میں سے ایک نے دیکھا کہ وہ انگور نچوڑ رہا ہے اور دوسرے نے دیکھا کہ وہ سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے ہے اور پرندے اس میں سے کھا رہے ہیں۔ بائبل (پیدائش۔ باب ۳۰) میں کچھ اس کی تفصیل دی گئی ہے۔ ان میں سے ایک قیدی بادشاہ کا ساقی تھا اور دوسرا خناز۔ بادشاہ نے کسی الزام کی بناء پر ناراض ہو کر ان کو قید میں ڈال دیا اور ان کے خلاف تحقیقات کرائی۔ یوسف علیہ السلام نے ان کے خواب کی تعبیر بتائی کہ "تم میں سے ایک (رہا ہو کر) اپنے آقا یعنی بادشاہ کو شراب پلائے گا" اور رہا دوسرا تو اس کو سولی پر چڑھایا جائے گا اور پرندے اس کے سر کو (نوج نوج کر) کھائیں گے۔ تعبیر کے مطابق ساقی الزام سے بری ثابت ہونے پر رہا ہو گیا اور اپنے منصب پر بحال ہو کر بادشاہ کا ساقی بن گیا جبکہ دوسرے پر الزام ثابت ہو گیا اور اس کو سولی پر چڑھا کر چھوڑ دیا گیا تاکہ پرندے اس کا گوشت کھائیں (لوگوں کی عبرت کے لیے)۔ اس طرح یوسف علیہ السلام کی بتائی ہوئی تعبیر حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔

اب چوتھا خواب بادشاہ مصر کا تھا۔ اس نے دیکھا کہ "سات موٹی گائیں ہیں جنھیں سات دلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات بالیں سرسبز ہیں اور سات سوکھی" (یوسف ۴۳)۔ بادشاہ نے اس خواب کی تعبیر اپنے درباری علماء فقہاء اور پیروں وغیرہ سے دریافت کی، وہ اس کی تعبیر نہ بتا سکے اور "اضغاث احلام" (یعنی خواب پریشاں) کہہ کر تعبیر بیان کرنے سے مجبوری و محذوری کا اظہار کیا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ یوسف علیہ السلام نے رہا ہونے والے قیدی سے (جو بحال ہو کر ساقی بنا) تعبیر بتانے کے بعد فرمایا تھا "اذ کونی عند ربک" اپنے آقا کے یہاں میرا ذکر کرنا لیکن "لئن اشد الشیطان ذکر وہ" (یوسف ۴۲) شیطان نے اس کو اپنے آقا سے ذکر کرنا بھلا دیا۔ یہ سب منصوبہ ربانی اور مشیت الہی کے تحت ہوا۔ یوسف علیہ السلام کا ساقی کو توجہ دلانا لیکن ساقی اس بات کو اس خاص موقع تک بھولا رہا (جبکہ تعبیر بتانے والے کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس کی گئی اور اس کا طلب میں خوب چرچا ہوا ہو گا) اور اس اہم موقع پر اس نے پورے اعتماد و وثوق کے ساتھ یوسف علیہ السلام کی طرف رجوع

کیا۔ یہاں قصہ کا یہ پہلو بھی سبق آموز ہے کہ یوسف علیہ السلام اس مرحلہ پر حلم و انفاق اور صبر و عزم کے پیکر نظر آتے ہیں۔ نہ تو ساتھی سے کوئی کلمہ و شکوہ ہے کہ تم نے اپنے قیدی ساتھی کی پرواہ بھی نہ کی تمہاری بھول کی وجہ سے تو میں اتنے عرصہ قید میں پڑا رہا اور نہ ہی اقتدار و وقت اور قوم مصر کے خلاف کوئی انتقامی جذبہ ہے کہ انہوں نے اپنی بد عنوانیوں اور بد اعمالیوں پر پروہ ڈالنے کے لیے ایک بے خطا و بے گناہ یا کہاؤ تو یوں ان کو طویل عرصہ تک اسیر زنداں بنائے رکھا۔ وہ تو بس مشیت الہی پر پوری طرح صابر و شاکر ہو کر منصوبہ ربانی کا ساتھ دے رہے ہیں۔ خواب کی تعبیر پوچھی جاتی ہے تو جواب دیتے ہیں:

”ترسات سال براب (فراوانی سے) کھیتی کرو گے“ پس جو فصل تم کا لو اس کو چھوڑو اس کی بال میں مگر تھوڑا سا جو ترکیہ پھر اس کے بعد سات سال سختی کے آئیں گے اس وقت وہ غلہ کھالیا جائے گا جو اس وقت کے لیے تم جمع کرو گے مگر وہ تھوڑا سا جو تم محفوظ کر لو گے پھر اس کے بعد ایک سال آئے گا جس میں لوگوں پر باران رحمت ہوگی اور وہ اس میں دس گچہ نہیں گے۔“

(یوسف ۷۳ تا ۷۹)

یوسف علیہ السلام نے خواب کی تعبیر میں (وحی کے اشارے پر) یہ پیش گوئی فرمائی کہ زراعت کی فراوانی کے سات سالوں کے بعد خشک سالی اور قحط کے سات سال آئیں گے جن میں پچھلے سات سالوں کا پس انداختہ کھالیا جائے گا سوائے اس کے جو بچ کے لیے محفوظ رکھا جائے۔ تعبیر خواب کے ساتھ یہ تدبیر بھی بتادی کہ قحط سالی سے نمٹنے کے لیے کیا انتظامی تدبیر بروئے کار لائی جائے۔ آپ نے یہ خوش خبری بھی سنادی کہ قحط سالی کے سات سالوں کے بعد پھر فراوانی کا سال آئے گا جس میں خوب بارش ہوگی اور عمدہ فصل کے ساتھ دودھ اور پھلوں کی کثرت ہوگی۔ اب یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ درباری علماء و مفتیان اور اعلیٰ پائے کے دانشوروں کا امتعات اعلام کی شکل میں کوراؤ کا سا جواب ملنے کے بعد اس بے یمن و مضطرب بادشاہ کو جب یہ جامع اور مربوط و مکمل تعبیر مد انتظامی تدبیر ملی ہوگی تو وہ کیا اس کو سن کر پھر گناہ انہما ہوگا اور مہر کی عقل و دانش فہم و فراست اور انتظامی صلاحیتوں کا (جس کے بارے میں اس طویل عرصہ میں بہت کچھ سن چکا ہوگا) پوری طرح قائل اور آپ سے ملاقات کا مشتاق و متحنی نہ ہو گیا ہوگا! قرآن بتاتا ہے۔

○ **وَاللّٰلِ الْمَلِكُ إِنْتُونِيْ ۖ هَـٰٓءِیَ الْخَبْرُ (یوسف ۵۰)**

ترجمہ: ”اور بادشاہ نے کہا کہ اس کو میرے پاس لے آؤ۔“

بادشاہ نے آپ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا اور اپنے قاصد کو یوسف علیہ السلام کے پاس بھیجا تاکہ وہ زنداں سے رہا کرا کے ان کو بادشاہ کے پاس لے آئے۔ ایک عام دنیا دار شخص تو اس مورد تحال پر خوشی میں پھولانے سلاتا اور آزادی کی فضاء میں نکل کر شاہی دربار میں رسائی کو انتہائی مبارک موقع سمجھ کر بادشاہ کو تسلیم کرنے کی پوری کوشش کرتا لیکن یوسف علیہ السلام کے لیے تو یہ اس منصوبہ الہی کی تکمیل کا مرحلہ تھا جس کے لیے رب حکیم و علیم و خبیر نے اپنے برگزیدہ نبی کو شدید ترین آزمائشوں سے گزارا تھا۔ چنانچہ جب وہ قاصد یوسف علیہ السلام کے پاس شاہی پیام لے کر پہنچا تو آپ نے مشیت الہی کے مطابق بغیر تذبذب و تردد پورے عزم و اعتماد کے ساتھ زنداں سے باہر نکلنے سے انکار کیا اور فرمایا:

○ **قَالَ اَوْجِعْ لِيْ ذِكْرًا لِّسَلْسَلَةِ النِّسْوَةِ الَّتِي قَطَعْنَ عَلَيْهِنَّ ۖ هَـٰٓءِیَ الْخَبْرُ (یوسف ۵۰)**

ترجمہ: ”کہا تم اپنے آقا کے پاس جاؤ اور اس سے پوچھو کہ ان عورتوں کا کیا معاملہ ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے۔“

جیسا کہ درج بالا سطور میں عرض کیا گیا یوسف علیہ السلام کو امور مملکت کی ذمہ داری کے علاوہ عظیم ربانی مشن

کو سراپا بنایا تھا اس لیے ضروری تھا کہ عوام الناس میں آپ کی شہرت و مقبولیت اور تعظیم و احترام کے لیے آپ کے معاملہ کو 'سیرت' کردار اور اخلاق کو بے داغ اور آئینہ کی طرح صاف و شفاف ثابت کر دکھایا جائے جیسا ایک برگزیدہ نبی کے شاہان شاں ہے اور آپ کی شخصی صلاحیتوں، ذہانت و فراست کی نمایاں برتری کا نہ صرف عوام بلکہ اہل دانش اور ارباب اختیار سے بھی لوہا منوا لیا جائے اور اس طرح آپ کو اس معاشرہ کی سطح سے ہر لحاظ سے اعلیٰ و ارفع ثابت کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے حالات کو پوری طرح موافق و سازگار بنایا گیا تھا۔ قید خانہ کی طویل و جاں غسل آزمائش کو بھی اسی لیے انگیز کیا گیا تھا کہ شیطان کے مکر و فریب کے منصوبہ کو طشت ازبام کیا جائے۔ چنانچہ شاہی پیا مبر کو یہ کہہ کر واپس کر دیا گیا کہ پہلے ان عورتوں کے معاملہ کی تحقیق کرائی جائے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے تاکہ اس بد کردار معاشرے کی مجربانہ ذہنیت کی حامل عورتوں نے اپنی خواہش نفس کے تقاضے پورا کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی جھوٹی برتری قائم رکھنے کے لیے ایک پاکیزہ سیرت نو جوان کے ساتھ جو مکر و فریب کا ڈرامہ رچانے کی مذموم کوشش کی تھی اس کا بھی پردہ چاک کر دیا جائے یہاں تک کہ حق کھل کر ظاہر ہو جائے اور معاملہ کی اصل صورت حال پوری طرح واضح ہو جائے۔ دو سرا پہلو یہ بھی قابل غور ہے کہ اللہ کے نبی کی عزت نفس اور شخصی وقار کا مسئلہ اللہ کے مشن کے ساتھ مربوط ہوتا ہے اس لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ نبی کو لوگوں کی نظروں میں بے بس و لاچار، اقتدار کے رحم و کرم کا محتاج اور اس کی رہائی کو شاہانہ نظر عنایت پر منحصر قرار دیا جائے۔ چنانچہ حالات کو اس رخ پر موڑا گیا کہ عوام و خواص پر یوسف علیہ السلام کی بے گناہی کے ساتھ یہ بات بھی پوری طرح منکشف و مسلم ہو جائے کہ ان کی قوم و ملک کی نجات و فلاح کے لیے یوسف علیہ السلام کی زنداں سے رہائی ناگزیر ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یوسف علیہ السلام کے حلم، ضبط و صبر کو سراہتے ہوئے فرمایا:

لَوْلَبِثْتُ فِي السِّجْنِ مَا لَبِثَ يَوْسُفُ ثُمَّ انْفَلَى النَّاصِي لَاجْتِنَبِ (بخاری و مسلم)

(اگر میں زنداں میں اتنی مدت رہتا جتنا کہ یوسف رہے پھر میرے پاس شاہی قاصد بلائے آتا تو میں اس کی دعوت قبول کر لیتا)

الغرض 'بادشاہ نے جب یہ سنا تو ان عورتوں کو بلوا کر وضاحت طلب کی کہ اصل معاملہ صاف صاف بیان کرو' کیا تم نے ہی یوسف کو بھانے اور اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کی تھی؟ انہوں نے جواب دیا:

○ قُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوءٍ (یوسف ۵۰)

ترجمہ: "وہ بولیں 'حاشا اللہ ہم نے اس میں برائی کی کوئی بات نہیں پائی۔'"

اس طرح یوسف علیہ السلام مختلف طور پر بری قرار دے دیے گئے اور عزیز مصر کی بیوی اس اعتراف میں سب سے آگے نکل گئی اس نے صاف صاف اعلان کیا "اب سچائی کھل چکی ہے" (سارا قصور میرا ہے) میں نے ہی اسے پھسلانے کی کوشش کی تھی۔ "بادشاہ پر بھی حقیقت حال پوری طرح منکشف ہو جانے کے بعد اب کوئی رکاوٹ نہ رہی اور اس کا شرعی ملاقات اور بھی شدید ہو گیا اور اس نے اس کا اظہار اس طرح کیا:

○ وَقَالَ الْمَلِكُ انْتَوَيْ بِدَاثَ تَلْعَلْ لِلنَّاسِ (یوسف ۵۳)

ترجمہ: ~~بادشاہ نے کہا کہ اس کو میرے پاس لاؤ میں اس کو اپنے (کام کے) لیے خاص کروں~~

اس شان کے ساتھ اللہ کا اولوالعزم پیغمبر زنداں سے باہر نکلتا ہے اور پورے وقار و حکمت کے ساتھ شاہی دربار میں داخل ہوتا ہے اور وہاں آپ کی بے پناہ وقار و جمال کی حامل مسکون کن شخصیت کی کماحقہ پذیرائی ہوتی ہے بادشاہ کی طرف سے اقرار و اعطاف ہوتا ہے۔

○ انک الیوم لکننا مکین امن (یوسف ۵۳)

”آج سے آپ ہمارے یہاں معزز و معتد ہیں۔“

اس بادشاہ نے اپنی دانست میں آپ کو بڑی پیش کش کر دی، لیکن یوسف علیہ السلام تو اس عرصہ میں شدید قسم کے تربیتی مراحل سے گزر چکے تھے، ان کے لیے نہ تو اندھے کنوئیں کی تکالیف و اضطراب حیرانی و پریشانی کا سبب بنیں اور نہ ہی بعد کی غلامی کا مرحلہ۔ نہ عز مصر کے یہاں آقاؤں کی پی پذیرائی ان کے لیے حیران کن تھی اور نہ ہی زنداں کے طویل روز و شب پریشانی و گھبراہٹ کا سبب تھے تو پھر یہ شاہانہ دربار کی شان و شوکت اور شاہی پیش کش کس طرح غیر متوقع ہو سکتی یا زہنی مرموبیت کا سبب بن سکتی تھی! آپ کو اندازہ تھا کہ یہ سب منصوبہ و مشیت الہی ہے اور عظیم مشن کا ایک مرحلہ، چنانچہ ایک قدم آگے بڑھ کر اس جاہ و حشم کے مالک سے عزم و اعتماد کے ساتھ مطالبہ کرتے ہیں:

○ قال اجعلنی علی خزائن الارض ای حلیظ علیم (یوسف ۵۵)

ترجمہ: ”اس نے کہا کہ مجھے ملک کے خزانہ کا نگراں و مختار کرد میں حفاظت کرنے والا اور (امور مملکت کا) جاننے والا ہوں۔“

سرسری طور سے مطالعہ کرنے والا مقالہ کا شمار ہو سکتا ہے کہ ”اجعلنی علی خزائن الارض“ شاید طلب اقتدار کی درخواست ہے اور اس انداز فکر سے الجھن پر الجھن اور شکوک پر شکوک کے لیے راہ کھلنے کا امکان ہے۔ لیکن قرائن اور واقعات کے تسلسل کو ملحوظ رکھ کر غور کیا جائے تو صحیح صورتحال باسانی واضح ہو جائے گی۔ درحقیقت معاملہ بالکل برعکس ہے۔ اول تو یہ تصور ہی محال ہے کہ محض ایک باصلاحیت شخص کی التجاء یا درخواست پر اقتدار تعالیٰ میں رکھ کر پیش کر دیا جائے! اور نہ ہی یہ بات قرین قیاس ہے کہ اللہ کا نبی اقتدار یا جاہ و حشم کا متمنی و طلبگار ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے لیے اپنی عزت نفس یا مال کر کے عاجزانہ التجاء کرے! یہاں ”اجعلنی علی خزائن الارض“ کا مطالبہ حالات کے طویل پس منظر میں انتہائی پر عزم اعتماد کے لب و لہجہ میں کیا گیا ہے جس کے بین السطور حکمراں طبقہ کے لیے تنبیہ ہے کہ ماضی کے حالات اور تجربات نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ تم لوگ امور مملکت اور حکومت کا نظم و نسق چلانے کے اہل نہیں ہو، اس لیے اگر ہلاکت و بربادی سے بچنا چاہتے ہو تو اختیار و اقتدار ایک اہل شخص کے حوالہ کر دو جو صحیح معنوں میں ”امین و حلیظ“ ہے اور یہ بھی محض دعویٰ نہ تھا بلکہ حالات و واقعات نے ثابت کر دیا تھا کہ اس معاشرے کے کہہ و سہہ (عوام و خواص) میں کوئی کسی بھی اعتبار سے ان کا مد مقابل نہ تھا! اسی لیے تو بادشاہ اور اس کی مشاورتی کونسل نے بغیر پس و پیش بسرو چشم اس کو قبول کر لیا۔ یہ لمحہ غور و فکر ہے کہ یہاں قادر مطلق کی معجزانہ کار فرمائی اور کرشمہ کاری عجیب ہی انداز سے دونوں مراحل میں رونما ہوتی ہے اور خود قرآن دونوں جگہ ان الفاظ میں اس کا ذکر فرماتا ہے: ”وکنانک مکننا لیوسف لی الارض.....“ (یوسف ۲۱) پہلے مرحلہ میں یہ ممکن ایک غلام کی حیثیت سے کہنے والے فرد کا عز مصر کے یہاں مالک و مختار بننا

تھا تاکہ انتظامی امور کی ابتدائی تربیت پایہ تکمیل تک پہنچے پھر دوسرے مرحلہ میں آپ زنداں سے نکلے ہی مسند اقتدار تک جا پہنچے ہیں اور اللہ کی طرف سے اعلان ہوتا ہے:

○ وكنالک مكنال یوسف علی الارض..... اجر المحسنین ○ (یوسف ۵۶)

ترجمہ: ”اور اس طرح ہم نے یوسف کو مسند اقتدار پر متمکن کیا“ وہ اس میں جہاں چاہے جگہ بنائے ہم جس پر چاہتے ہیں اپنی رحمت کے ساتھ متوجہ ہوتے ہیں“ اور ہم محسنوں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔“
مشرکین مکہ کے اس سوال کا کہ بنو اسرائیل مصر کیسے آئے اور یوسف علیہ السلام کو مصر میں متمکن کیسے حاصل

ہوا، وحی الہی نے مکمل اور جامع جواب دے دیا اور ساتھ ہی بین السطور یہ پیش خیری بھی فرمادی کہ تم یہ بھی دیکھ لینا کہ بالکل اسی طرح اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ماننے والوں کو مکہ میں غلبہ اور متمکن حاصل ہوگا۔ اور یہ تو دنیا ہی کی عزت و سرفرازی ہے آخرت کا اجر تو مومنوں اور متقیوں کو کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر ملنے والا ہے۔ بعض لوگوں کو یہ اشکال ہوتا ہے کہ شاید یہ متمکن غلبہ کی تقسیم کی حد تک ہی ہے۔ یہ موقف درج بالا آیت سے مطابقت نہیں رکھتا۔ قرآن مطلق اقتدار کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کی تائید سورۃ میں بعد کی آیات سے بھی ہوتی ہے اس کی وہاں مزید وضاحت کی جائے گی۔

۶۔ ماہر امور مملکت: اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ نبی کو سرزمین مصر میں فرمانروائی عطا فرمائی تاکہ یوسف علیہ السلام اور ان کی قوم کو ایک اللہ کی نافرمان قوم کے مقابلہ میں متمکن و غلبہ عطا فرما کے انقلابی اصلاحات کی راہ ہموار کی جاسکے اور ساتھ ہی اللہ کے بندوں کو قحط کی ہلاکت خیزی سے بھی بچایا جاسکے۔ یوسف علیہ السلام کو اخلاق و کردار کے اعلیٰ ترین اوصاف کے ساتھ حکومت کے نظم و نسق اور امور مملکت کے انتظام و انصرام کی اعلیٰ صلاحیتوں سے بھی نوازا گیا تھا جس کا بین ثبوت قحط سالی کے مسئلہ پر قابو پانے کے لیے ان کا بے مثال طریقہ کار تھا جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا انہوں نے پہلے ہی مشورہ دیا تھا:

○ لما حصدتم قنوزہ ولی سبلہ الا قلیلا معانا کلونہ..... (یوسف ۴۷)

ترجمہ: ”ارزانی و فراخی کے دوران جو فصلیں تم کاٹو ان کو بالوں میں چھوڑ دو سوائے اس تھوڑے حصے کے جو تم خوراک میں استعمال کرو۔“

اب زمام اختیار سنبھالنے کے بعد اس تدبیر پر عمل کیا۔ تو رات میں کچھ تفصیل بیان کی گئی ہے۔ یوسف علیہ السلام نے مصر میں دورہ کیا اور فراوانی کے سالوں میں مختلف علاقوں میں غلے کے بڑے ذخیرے جمع کر لیے جو قحط سالی میں بخوبی استعمال ہوئے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور تائید و توفیق سے ایک موثر تدبیر کے ذریعہ تاریخ انسان کے شدید ترین قحط پر قابو پایا گیا۔

قحط کی شدت سے نہ صرف مصر بلکہ آس پاس کے علاقے شام و فلسطین، اردن وغیرہ بھی بری طرح متاثر ہوئے تھے لیکن مصر میں حسن تدبیر سے جمع کئے ہوئے غلے کے ذخیروں کی وجہ سے قحط سالی کے دوران خوب فراوانی رہی اور متاثرہ علاقوں کی ضرورت پوری کرنے کے لیے بھی یہ ذخیرے کافی ہو گئے۔ جب یہ خبر پہلی کہ مصر میں غلہ سستے داموں مل رہا ہے تو مختلف علاقوں سے قافلے غلہ حاصل کرنے مصر آنے لگے چنانچہ کھان سے برادران یوسف بھی اسی کوشش میں مصر آئے اور ان کی شاہی دربار تک رسائی ہوئی۔ اس طرح پچھڑے ہوؤں کے رابطے کی راہ کھلی۔ قرآن اس ملاقات کے منظر کو پیش کرتا ہے:

○ وجاء اخوة یوسف..... مشکرون ○ (یوسف ۵۸)

ترجمہ: ”اور یوسف کے بھائی مصر آئے پھر اس کے پاس پہنچے تو یوسف نے ان کو پہچان لیا اور انہوں نے اس کو نہ پہچانا۔“
یعنی برادران یوسف جب شاہی دربار میں پہنچے تو یوسف علیہ السلام نے تو انہیں پہچان لیا لیکن وہ ان کو نہ پہچان سکے اور وہ ان کو

بچاتے بھی کیسے!۔ میں سال پہلے انہوں نے ایک کم سن لڑکے کو کنوئیں میں ڈالا تھا لیکن اب وہ تقریباً چالیس سال کا تجربہ کار بہادر عہد اور پروکار شخصیت کا حامل انسان تھا۔ ممکن ہے انھیں کچھ بھائی کی جھلک محسوس ہوئی ہو لیکن وہ یہ تو گمان بھی نہ کر سکتے تھے کہ جس بھائی کو انہوں نے کنوئیں میں ڈال کر کسی مصر کے گھرانے کا غلام بنایا تھا وہ اب اس شان سے مسند اقتدار پر فائز اور امور مملکت کا مطلق مختار ہو گا!۔ بہر حال یوسف علیہ السلام نے بھائیوں کو غلہ حسب خواہش دیا اور غلہ کی تقسیم کے دوران افراد خانہ کا ذکر بھی ہوا ہو گا (کیونکہ ایسے حالات میں تعداد افراد کا خیال رکھا جاتا ہے) چنانچہ یوسف علیہ السلام نے جب ان کو یہ بتایا کہ انھیں دوبارہ بھی آنا ہو گا کیونکہ قلیل شدید ہے اور اس کا اثر طویل عرصہ رہے گا تو اس ضمن میں آپ نے ان پر زور دیا کہ اپنے سوتیلے بھائی بن یحییٰ کو بھی لے کر آئیں والد صاحب کے نہ آنے کے لیے تو کبر سنی کا عذر معقول ہے ان کی عدم موجودگی میں اس عذر پر غلہ مل سکتا تھا لیکن جو ان بھائی کے نہ آنے کا کوئی عذر قائل قبول نہیں ہو سکتا چنانچہ ان کو تنبیہ کی گئی کہ اگر وہ بھائی کو لے کر نہ آئے تو خود انھیں بھی غلہ نہ دیا جائے گا۔ (یوسف ۶۰) پھر ان لوگوں کی واپسی کے وقت اپنے کارندوں کو اشارہ کیا کہ وہ مال (یا پونجی) جو انہوں نے غلہ کے عوض دیا تھا اس کو خاموشی کے ساتھ ان کے سامان میں واپس رکھ دیں تاکہ وہ یوسف علیہ السلام کی فیاضی اور حسن سلوک سے متاثر ہوں اور جذبہ احسان مندی انھیں دوبارہ آنے پر ابھارے۔ ایک طرف تو حاکمانہ رعب اور دھمکی تو دوسری طرف دل موہ لینے والی محبتانہ روش یہ بلاشبہ یوسف علیہ السلام کی معاملہ فہمی اور ذہانت و فراست کا بین ثبوت ہے۔ الغرض برادران یوسف جب گھر پہنچے تو انہوں نے اپنے والد یعقوب علیہ السلام کو مقام سرگزشت سنائی اور بتایا کہ آئندہ بن یحییٰ کو ساتھ لے جانا اشد ضروری ہے ورنہ ہمیں غلہ نہ مل سکے گا اور ہم ان کی پوری طرح حفاظت و نگرانی کرتے رہیں گے (واللہ اعلم بالصواب)۔ پھر جب ان کی پونجی (مال) بھی ان کے سامان میں واپس مل گئی تو ان کی خوشی کی کوئی انتہاء نہ رہی اور بھی زیادہ جوش و خروش سے والد صاحب پر زور دیا۔ یعقوب علیہ السلام نے شروع میں بن یحییٰ کو ساتھ بھیجنے سے انکار کیا اور کہا "کیا میں اس کے معاملہ میں تم پر ویسا ہی اعتماد کروں جیسا کہ اس کے بھائی کے معاملہ میں کیا تھا؟" (یوسف ۶۳)۔ آخر کار ان کے اصرار پر تیار ہو گئے لیکن سخت عہد و پیمان کے بعد: "میں اس کو ہرگز تمہارے ساتھ نہ بھیجوں گا جب تک تم مجھ سے اللہ کے نام پر عہد و پیمان نہ کرلو کہ تم اسے ضرور میرے پاس واپس لے آؤ گے والا یہ کہ تم سب گھیر ہی لیے جاؤ۔" (یوسف ۶۶)۔ چنانچہ جب اس طرح متفقہ عہد و پیمان کے بعد انہوں نے بن یحییٰ کو بحفاظت واپس لانے کا اطمینان دلایا تو یعقوب علیہ السلام نے اکتھار رضا مندی فرما دیا اور چلتے وقت بطور احتیاط نصیحت فرمائی:

وَاللّٰہِ بِنِیْ لَا تَتَّبِعُوا اٰمِنًا بَابًا وَّاحِدًا وَاَدْخُلُوا اٰمِنًا اَبْوَابًا مُّتَفَرِّقَةً ط الْمَوْتُ کُلُّوْنَ ○..... (یوسف ۶۷)

ترجمہ: "اور یعقوبؑ نے کہا اے میرے بیٹے تم سب ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ مختلف دروازوں سے (مصر میں) جانا۔ اور میں تم کو اللہ کی مشیت سے (کسی چیز سے) نہیں بچا سکتا، حکم اللہ کے سوا کسی اور کا میں چلتا۔ میں نے اسی پر بھروسہ کیا اور بھروسہ کرنے والے اسی پر بھروسہ کریں۔"

ایک بیٹے کی جدائی کے بعد دوسرے کی مفارقت رفیق القلب باپ پر کتنی گراں گزری ہوگی اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے! اس حال میں بشری تقاضے کے تحت کچھ احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کی ہدایت کی جارہی ہے لیکن ساتھ ہی ان کو یہ واضح کر دیا ہے کہ میں نے یہ نصیحت محض احتیاط کے طور پر ہی کی ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کی مشیت سے اگر کچھ ہونے والا ہو تو اس سے میں تمہیں نہیں بچا سکتا۔ تدبیر و توکل کا یہ ایک اصولی نکتہ ہے جس کی یہاں وضاحت کی گئی ہے۔ اس عالم اسباب میں تمام انسان بشمول انبیاء علیہم السلام اسباب کے پابند ہیں اور سب ہی اللہ پر توکل کرتے ہوئے خارجی اسباب کے تحت احتیاطی تدابیر اختیار کرتے ہیں۔ اور یہ طریقہ کار کسی طرح بھی ایمان باللہ اور توکل علی اللہ کے خلاف نہیں۔ دوسرے یہ کہ اللہ کے بندوں کی تدابیر (خواہ انبیاءؑ ہی کی کیوں نہ ہوں) اللہ کی مشیت و احکامات کے تقاضے میں

ذرا بھی غل یا اثر انداز نہیں ہو سکتیں، حکم تو بس اللہ ہی کا چلتا ہے اور تمام معاملات کا وارود اسی کی مرضی و مشیت پر ہے۔ باپ کا اذن مل جانے کے بعد یہ کنعانی قافلہ بن یحییٰ بن معیت میں مصر پہنچا، بیٹوں نے والد صاحب کے حکم کی تعمیل کی لیکن رب کی مشیت کے مقابلہ میں احتیاطی تدبیر کچھ کام نہ آسکی فرمایا :

○ ولما دخلوا من حيث اسرهم ابوهم ۛ ما كان يغني عنهم من الدين شيئا..... لا يعلمون ○ (یوسف ۶۸)

ترجمہ: "اور جب یہ (مصر میں) داخل ہوئے اسی طرح داخل ہوئے جس طرح ان کے باپ نے ان کو حکم کیا تھا تو یہ احتیاط ان کو اللہ تعالیٰ (کی مشیت) کے مقابلہ میں کچھ کام نہ آئی، ہاں مگر یہ خیال تھا یعقوبؑ کے دل میں جسے اس نے پورا کر لیا اور وہ بلاشبہ صاحب علم تھا اور ہم نے ہی اس کو یہ علم سکھایا تھا مگر اکثر لوگ (حقیقت) نہیں سمجھتے۔"

یعنی یعقوب علیہ السلام نے احتیاطی تدبیر ہمارے عطا کئے علم و حکمت کے مطابق ہی اختیار کی تھی لیکن اللہ کی مشیت جو ہمیشہ مصلحت پر مبنی ہوتی ہے (لیکن انسان اکثر و بیشتر مصلحت ربانی کو نہیں سمجھ پاتے) کبھی تدابیر اس مشیت الہی کے خلاف ہونے کی وجہ سے ناکارہ ثابت ہوتی ہیں جیسا کہ بعد کے واقعات نے ثابت کیا تھا کہ توقعات کے برعکس بن یحییٰ کو روک لیا گیا۔ بظاہر تو یہ صورتحال پریشان کن تھی لیکن بعد کے واقعات نے ثابت کیا کہ نہ صرف بن یحییٰ بلکہ پورے خاندان یعقوبؑ کے حق میں بہتر ہوا۔ قرآن کے مطابق برادران یوسفؑ جب وہاں پہنچے تو یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی کو اپنے پاس ہی بلا لیا اور اسے بتا دیا کہ میں ہی تیرا بھائی ہوں، اب تو ان کی بدسلوکی پر غمگین نہ ہونا۔ بھائیوں کی خالمانہ سرشت اور بدسلوکی کو مد نظر رکھتے ہوئے یوسف علیہ السلام کیسے گوارا کرتے کہ بن یحییٰ کو پھر انہی کے ساتھ واپس بھیج دیں لیکن رائج الوقت مصری قوانین کے تحت کسی غیر ملکی کو بغیر حقول وجہ کے روکنا ممکن نہ تھا اور یوسف علیہ السلام کے لیے اس وقت اپنے راز کو افشاء کرنا بھی خلاف مصلحت تھا۔ ان حالات میں دینی طریقہ کار پسندیدہ اور موزوں ترین تھا جو انہوں نے بھائی کو روک لینے کے لیے اپنایا، اس کے علاوہ اور کوئی مناسب چارہ کار نہ تھا۔ چنانچہ بھائیوں کی سواریوں میں قلعہ لدواتے ہوئے اپنا پیالہ بن یحییٰ کی سواری میں (خفیہ طور سے) رکھ دیا بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس خفیہ تدبیر کا علم یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائی کے علاوہ کسی اور کو نہ تھا چنانچہ کارندوں کو جب گم شدگی کا پتہ چلا تو انہوں نے پہلے اس کا اعلان کیا پھر غیر ملکی لوگوں یعنی کنعانی قافلہ والوں پر شک کرتے ہوئے ان کے سامان کی تلاشی لی۔ پہلے برادران یوسفؑ کا سامان چیک کیا گیا پھر بن یحییٰ کے سامان کی تلاشی لی تو اس میں پیالہ برآمد ہو گیا اس طرح شریعت ابراہیمی کے مطابق یوسف علیہ السلام کے لیے اپنے بھائی کو روک لینے کا جواز فراہم ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو ربانی تدبیر قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

كذلك كذب يوسف ۛ..... علم علم ○..... (یوسف ۷۶)

ترجمہ: "اس طرح ہم نے یوسف کے لیے تدبیر کی، وہ بادشاہی قانون کی رو سے اپنے بھائی کو نہ لے سکتا تھا، مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ ہم جس کے چاہتے ہیں درجات بلند کرتے ہیں اور ہر علم والے سے بلند و فوق ایک علم والا ہے۔"

یہ بھی ممکن ہے جیسا کہ بعض مفسرین نے استدلال کیا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے پیالہ محض نشانی کے طور پر ہی رکھا ہو لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو ٹھوس تدبیر امر بنا کر مقصد کا ذریعہ بنا دیا۔ بہر حال یوسف علیہ السلام کے لیے یہ موقع امتحانی خوشی و مسرت اور رب کی شکر گزاری کا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مشکل حل کر دی اور ان کے لیے حالات کو سازگار بنا دیا۔ چنانچہ بن یحییٰ کو روک لیا گیا اس پر برادران یوسفؑ کا جذبہ حسد اور بھڑک اٹھا اور انہوں نے نہایت ہی بے باکی سے جھوٹ پر جھوٹ بولتے ہوئے کہا کہ "مگر اس نے چوری کی ہے تو یہ تعجب کی بات نہیں اس سے پہلے اس کا بڑا بھائی بھی چوری کر چکا ہے!" (یوسف ۷۷)۔ معاذ اللہ! انسان جب شیطان کے ہاتھ میں کھیلنے لگے تو خود ہی شیطان بن جاتا ہے۔ قرآن نے دو کرداروں کا کیسا تضاد و تقابل پیش کر دیا ہے ایک طرف استغاثی شریف النفس و پاک طبیعت صبر و ضبط نفس

کے محنتانہ اوصاف سے آراستہ یوسف علیہ السلام کا کردار ہے جو بالمشافہ صریحاً "جھوٹ پر مبنی لغو الزام سن لینے کے بعد بھی مسکرا کر خاموش ہو جاتے ہیں اور اپنے معاملہ کو اللہ کے سپرد کر کے اس کے فیصلہ کا انتظار فرماتے ہیں" تو دوسری طرف یہ سفاک اور شقی القلب برادران یوسف ہیں جو اپنے بھائی کی (بن یحییٰ) مدافعت نہ کر سکتے تھے تو خاموشی ہی اختیار کرتے" اس کے برعکس وہ ان نیک خواہ پاکیزہ بھائیوں پر ہر قسم کے مظالم توڑ لینے کے بعد اب بے بنیاد الزام و اتہام تراشی پر اتر آتے ہیں، کیسے بے خوف ہیں آخرت کی جواب دہی اور اللہ کی پکڑ سے!۔ دنیا پرستوں کے طرز عمل کا مفاد پرستانہ یہ پہلو بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ مسند اقتدار پر متمکن یوسف علیہ السلام کے سامنے تو برادران یوسف کی گردنیں جھکی ہوئی ہیں، خوشامداتہ روش ہے اور اس کو "عزیز مصر" (یعنی حضور سرکار و خیر) کے القاب سے خطاب کیا جا رہا ہے لیکن ٹھیک اسی وقت ان کا بھائی یحییٰ کا جوان سال (دو بیسائی) یوسف ناحق اور بے بنیاد جھوٹے الزام میں ملوث کیا جا رہا ہے!! ان لوگوں کے لیے یہ گھبراہٹ و پریشانی والی بات تھی، باپ سے کیا ہوا محمد و یحییٰ ذہن و خیال میں چٹکیاں لے رہا تھا۔ قادر مطلق کی قدرت کاملہ بھی باغی و سرکش سے بھرپور انتقام لیتی ہے۔ ابھی تو دعویٰ کیا تھا کہ "اللہ کی قسم تم جانتے ہو کہ ہم لوگ اس ملک میں فساد کرنے نہیں آئے اور نہ ہم کبھی چور تھے" (یوسف ۷۳) اور زبان کی دوسری کڑھ سے نہ صرف بن یحییٰ کو چور تسلیم کیا بلکہ غیر موجود بھائی کو بھی چور قرار دے دیا اور اس طرح پہلے بیان کی تردید میں اپنے خاندان کو "چوروں کا خاندان ثابت کرتے ہوئے" اپنی ہی زبان سے اپنے آپ کو جھوٹا ثابت کر دکھایا اور جن کارندوں کے سامنے پاکبازی کا دعویٰ کیا تھا ان ہی کی نظروں میں اپنی رسوائی کا سامان فراہم کر دیا!۔ اسی لحاظ سے یوسف نے دل میں کہا "قَالَ اَنْتُمْ مُرْتَكِبُونَ اِثْمًا وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصْنَعُونَ" (یوسف ۷۷) یعنی "تم لوگ اپنے ہی لیے برا مقام بنا رہے ہو اور اللہ خوب جانتا ہے حقیقت حال کو"۔ انجام کار قول ہار جانے کے بعد رسوائی اور پسپائی سے دوچار ہو کر منت سلامت اور خوشامداتہ روش اختیار کرتے ہوئے اتجا کرتے ہیں کہ:

"اے عزیز مصر! اس کا باپ بہت بوڑھا ہے (اس کو تو پہلے ہی ایک بیٹے کا غم لاحق ہے) آپ اس کی جگہ ہم میں سے کسی ایک کو روک لیں، ہم آپ کو بہت ہی نیک دل پاتے ہیں"..... (یوسف ۷۸)

یوسف علیہ السلام ان کو جواب دیتے ہیں:

قَالَ مَا ذَلِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ اٰمِنًا ۝ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصْنَعُونَ (یوسف ۷۹)

ترجمہ: اس نے کہا "ما اللہ کی پناہ کہ ہم اس کے سوا کسی کو پکڑیں جس کے پاس ہم نے اپنی چیز پائی ہے" اس صورت میں تو حضور ظالم ٹھہریں۔

کیسا نمایاں فرق ہے دو کرداروں میں یوسف علیہ سب کچھ سننے، دیکھنے اور سننے کے باوجود صبر و حلم کے ساتھ خاموشی اختیار کئے رہے اور اب مجبوراً "اب لسانی کرنی ہی پڑی تو زبان سے صرف یہی الفاظ ادا ہوئے کہ "مَنْ وَجَلْنَا مَتَاعَنَا عَنْدَهُ" (جس کے پاس ہم نے اپنی چیز پائی ہے) یہ نہیں کہا کہ "ہم نے ہمارا سامان چرایا ہے"۔ حفظ اللسان اور احتیاط کی کیا اعلیٰ شان ہے اور ایک انسانی پیچیدہ صورتحال سے عمدہ برآ ہوئے کا بہت دور وقار اور حقیقتانہ انداز ہے۔ برادران یوسف "ما یوس ہو کروائیں کنگان پختے ہیں اور والد صاحب سے صورتحال کو اپنے انداز سے بیان کرتے ہیں" کہ تمہارے بیٹے نے چوری کی ہے۔ "حکیم الطبع و خیر ایسی شدید آزمائش میں بھی صبر کا دامن نہیں چھوڑتا اور مشیت الہی پر صبر و شاکر ہو کر جواب دیتا ہے:

قَالَ هَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اِسْرًا ۙ فَصَبِّرْ ۚ بِمِثْلِ مَا رَكَبَتْ اَنْفُسُكُمْ (یوسف ۸۳)

ترجمہ: "باپ نے (یہ سن کر) کہا "دراصل تمہارے نفس نے ہی تمہارے لیے ایک بات بتائی ہے، پس میں تو اس پر صبر جمیل کروں گا امید ہے کہ اللہ ان سب کو میرے پاس لے آئے گا وہ خوب جاننے والا حکیم ہے۔"

اس طرح یعقوب علیہ السلام نے بیٹوں کی بکروی اور شیطانیت کی نشاندہی پر وقار انداز میں فرما دی اور محبوب و مظلوم بیٹوں کے غم میں مدد حال ہونے کے باوجود یہ جتا دیا کہ وہ رب رحیم کی رحمت سے پر امید ہیں کہ ان کے بیٹے ان کو مل جائیں گے۔ شقی القلب بیٹے اس حال میں بھی طعن و تشنیع اور غمگین باپ کی دل آزاری سے باز نہیں آتے اور کہتے ہیں کہ ”تم تو یوسف کے غم میں خود کو ہلاک ہی کر ڈالو گے“ تو اس پر بھی انتہائی تحمل سے جواب دیتے ہیں:

انما اشكو اضی وحلنی الی اللہ واعلم من اللہ لا تعلمون ○..... (یوسف ۸۶)

ترجمہ: ”میں اپنے رنج و غم کی فریاد اللہ ہی سے کرتا ہوں (کسی اور سے نہیں) اور میں اللہ کی طرف سے وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔“

اس طرح بیٹوں کے کروت پر زبرد تو بیچ کی بجائے اپنا درد و غم مالک حقیقی کے سامنے پیش کرتے ہیں اس کی مشیت پر صابر و شاکر ہیں اور اس کی رحمت سے قطعی مایوس نہیں یوسف علیہ السلام کے خواب کی بشارت بھی ذہن میں تازہ ہوگی چنانچہ انجام کار خیر کی توقع رکھتے ہوئے بیٹوں کو پر امید لہجہ میں نصیحت فرماتے ہیں:

”اے بیٹو جاؤ یوسف اور اس کے بھائی کو تلاش کرو اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو اللہ کی رحمت سے تو صرف کافر ہی مایوس ہوا کرتے ہیں“..... (یوسف ۸۷)

باپ کے اصرار پر اور قحط کی شدت کے پیش نظر غلہ کے حصول کے لیے برادران یوسف علیہ السلام تیسری مرتبہ مصر روانہ ہوتے ہیں اور شاہی دربار میں حاضر ہو کر اپنے گھر کی پریشان حالی کا ذکر کرتے ہیں اور کم پونجی کے باوجود نہایت ہی عاجزی کے ساتھ پورا بار شتر غلہ حاصل کرنے کی التجاء کرتے ہیں۔ ایک سعید الفطرت انسان کے لیے یہ چیز بھی ناقابل برداشت ہوتی ہے کہ وہ فراخی اور عیش کی زندگی گزارے اور اس کے اہل خانہ محکمہ سستی کا شکار ہوں اس لیے اب معاملہ کو مزید طول دنیا بالکل مناسب نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے سازگار حالات کو پورے تسلسل کے ساتھ مختلف مراحل سے گزار کر یہاں تک پہنچا دیا کہ یوسف کو اندھے کونٹوں میں ڈالنے والے آج انہی کے آگے بے بسی اور درماندگی کی حالت میں ہاتھ پھیلائے غلہ کے طلبکار کھڑے ہیں!۔ اب جبکہ قدرت کا انتقام مکمل ہو گیا وقت آگیا کہ حقیقت سے پردہ اٹھا دیا جائے چنانچہ یوسف علیہ السلام کا ایک گفتگو کا رخ بدل کر فرماتے ہیں:

”کیا تمہیں خبر بھی ہے کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا جبکہ تم ٹاوان تھے؟“..... (یوسف ۸۹)

اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اپنی التجاء کے جواب میں یہ دھماکہ خیز بات سن کر برادران یوسف تو درطہ حیرت میں ہی غرق ہو گئے ہوں گے۔ چنانچہ شدت استعجاب میں انہوں نے چونک کر پوچھا کہ

”کیا (واقعی) تم ہی یوسف ہو؟“..... (یوسف ۹۰)

یوسف علیہ السلام نے جواب دیا:

”میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے جو تقویٰ اور پرہیزگاری کی روش اختیار کرے اور (مصائب میں) صبر کرے تو اللہ تعالیٰ محسنوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔“..... (یوسف ۹۰)

۷۔ اعلیٰ ظرف اخ کریم: خود کرنے کا مقام ہے کہ ایسے موقع پر جبکہ جذبات میں تلاطم ہو اور حالات غیظ و غضب کو بھڑکانے والے ہوں، ایک محسن و مصلح کس قدر حلم و اناة کا پیکر اور صبر و ثبات کی گویا چٹان ہوتا ہے چنانچہ انتہائی جامع انداز اور جذبہ تشکر سے سرشار لہجہ میں بھائیوں کو صبر و تقویٰ کی نصیحت فرمائی اور بہت ہی خوبصورت انداز میں جتا دیا کہ تم لوگوں نے اللہ سے بے خوفی اور بے صبری کا طرز عمل اختیار کر کے اپنے بھائیوں کے ساتھ جو ہیمنہ سلوک کیا تھا تو پھر کیا پایا؟۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنی عنایت اور نوازش سے میرے صبر و تقویٰ کا

کیا انعام عطا فرمایا ہے! بھائی اس کا کیا جواب دیتے! وہ تو عرقِ ندامت میں غرق ہیں ان کے پاس سوائے خسرو ساری اور بھونانہ احساس کمتری کے اور کیا ہے۔ جائے ہجرت ہے کہ اپنے دشمن شیطان لعین کے ہاتھ میں کھلونا بن کر نفسِ امارہ کی اطاعت کرنے والے کس طرح رسوائی سے دوچار ہوتے ہیں! اور آخرت کی ذلت و رسوائی تو یقیناً ہزار ہا گنا زیادہ ہے۔ بہر حال اب حقیقت کھل جانے کے بعد تو ماضی کے تمام گرتوت اور بھونانہ سرگرمیوں کا پورا نقشہ ان کی آنکھوں کے سامنے ہو گا اور خود کو عنصرِ مصر کی عدالت کے کتیرے میں ہی مشہور کر رہے ہوں گے۔ لیکن تاہم یہ اس رحمِ دل بھائی کا نرم رویہ تھا کہ ان کو لب کشائی کی جرات ہوئی اور سر جھکا کر بہت ہی عاجزی سے اعتراف کیا۔ یہاں قرآن اس مکالمے کی بدستور دلنشین انداز میں منظر کشی کرتا ہے ملاحظہ ہو:

○ قالوا تالله لقد آفرك الله علينا وإن كنا لعطوفين ○ قال لا تغرب عليكم اليوم ○ يغفر الله لكم وهو أرحم
الرحمن ○ (یوسف ۹۱-۹۳)

ترجمہ: ”(بھائیوں نے) کہا ”اللہ کی قسم بلاشبہ اللہ نے تم کو ہم پر فضیلت دی ہے“ اور بھنگ ہم ہی قصودار تھے۔ (یوسف نے) کہا ”آج تم پر (مصری طرف سے) کوئی الزام نہیں“ اللہ تمہیں معاف فرمائے“ وہ سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا۔ یہاں ایک لمحہ کے لیے ٹھہر کر یہ سوچ لیا جائے کہ اس موقع پر تقویٰ سے عاری اور یوم حساب سے بے پرواہ انسان ایسے ظالم و سفاک سوتیلے بھائیوں کو اپنے قابو میں پا کر شدت غیظ و غضب اور جوش انتقام میں صرف زبانی طعن و تشنیع اور زجر و توبیخ پر ہی اکتفا نہ کرے گا بلکہ قرار واقعی سزا دینا بھی ضروری اور جائز خیال کرے گا تاکہ (اس کے اصول کے مطابق) دنیا والوں کو ہجرت حاصل ہو۔ لیکن اللہ کے برگزیدہ نبی کا معاملہ کس قدر مختلف ہے! وہ شیطان کے وار کو قطعاً کارگر نہیں ہونے دیتا، اپنے نفس کو اس قسم کی تاویل کا موقع ہی نہیں دیتا، بلکہ وہ اس سطح سے بلند ہو کر اعلیٰ عرفی اور بلند اخلاقی کا ایک عظیم اور نقید المثال نمونہ پیش کر دیتا ہے تاکہ وہ رہتی دنیا تک لوگوں کے لیے صیحت و مصلحت کا ذریعہ بنا رہے۔ یوسف علیہ السلام نے یہی مثال پیش کر دکھائی۔ اللہ تعالیٰ نے حالات کے روپ میں ان کی طرف سے پورا ہی انتقام لے لیا تھا لیکن اب جبکہ ان کی اپنی باری آئی تو انہوں نے انتہائی عالی عرفی اور فراخ دلی کے ساتھ ماضی کی شدید تہنیروں کو یکسر بھلا دیا اور بغیر کسی پس و پیش کے بھائیوں کے ساتھ مشفقانہ و کریمانہ سلوک کر کے برادرانہ تعلقات استوار کر لیے۔ ان کو اپنی طرف سے تمام الزامات سے بری قرار دے دیا اور پھر ان کے سامنے ہی اللہ سے ان کے لیے معافی و مغفرت کی دعا فرمائی پھر ان سے کہا کہ ”تم میرا چہرہ بن لے کر جاؤ اور اس کو والد کے چہرے پر ڈالو (انشاء اللہ) ان کی بیٹائی واپس آجائے گی۔ پھر گھر والوں کو یہاں لے آؤ۔“ (یوسف ۹۳) اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی کرشمہ کاری بھی ملاحظہ کیجئے۔ یوسف کو ان کے بھائیوں نے جن ہاتھوں سے چاہ کھان میں ڈال کر ان کا بنوئی طون آلود چہرہ بن لے جا کر والد صاحب کی خدمت میں پیش کیا تھا اور جن زہانوں سے معمولی اور پر فریب داستان سنا کر غمگین باپ کے قلب و جگر کو چھلنی کیا تھا اور یہی غم ان کی بیٹائی ضائع ہونے کا سبب بنا اب انہی ہاتھوں سے زندہ یوسف کا چہرہ بن لے کر باپ کے زخموں پر مرہم رکھنے جا رہے ہیں تاکہ انہی زہانوں سے ان کے اقتدار، عزت و سرفرازی کی سرگزشت بھی سنا دیں اللہ جب یہ کھائی قافلہ چہرہ بن یوسف کے ساتھ مصر سے روانہ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے مجرمانہ طور پر سیکڑوں میل کے فاصلہ پر یعقوب علیہ السلام تک اس کی طوشیہ پہنچا دی اور انہوں نے بیٹوں کو بتایا کہ ”اگر تم مجھے بدحواسیہ میں سلجھایا ہو تو کہو تم میں ہمارا کہ مجھے یوسف کی منک آ رہی ہے“ (یوسف ۹۴) بیٹوں نے توقع کے مطابق مذاق اڑایا اور کہا آپ پر تو ابھی پرانا خط ہی سوار ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ناظران بیٹے ابھی تک قسارت و خفاوت قلبی کا فکار تھے اور اپنے باپ کے غم و فراست اور محبت کے ذرا بھی قدر داں نہ تھے۔ المرض یہ لوگ کھان چوسنے اور چہرہ بن یوسف باپ کے چہرے پر ڈالنا تو اللہ کے حکم سے یعقوب علیہ السلام کی بیٹائی واپس آگئی اس وقت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا:

”کیا میں تم سے نہ کہتا تھا کہ اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔“ (یوسف ۹۶)

اپنے بوڑھے باپ کے ناقدرداں بیٹے اب شرم ساری اور غمت سے سرشار ہیں، عرقِ ندامت میں غرق گردن جھکائے ہوئے کہتے ہیں "اے ابا جان! ہمارے گناہوں کی معافی کے لیے دعا فرمائیے بلاشبہ ہم خطا کار تھے۔" (یوسف ۹۷)۔ یعقوب علیہ السلام ان کے لیے دعائے استغفار کا وعدہ فرماتے ہیں پھر یعقوب علیہ السلام مع اپنے خاندان مصر روانہ ہوتے ہیں۔ تو رات میں اس واقعہ کو کافی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ مختصراً یہ کہ وہاں پہنچنے پر ان کا شایانِ شان طریقے پر استقبال کیا گیا۔ یوسف علیہ السلام نے اپنے والدین کو اپنے پاس بٹھایا اور (باقی کتبہ والوں سے) کہا کہ "مصر (شر) میں چل کر آرام سے رہو" انشاء اللہ " (یوسف ۹۹)۔ آگے قرآن کا بیان ہے:

○ و رجع ابوہ علی العرش و خروا لہ السجنا ج وقال ہاتھنا واول و عیالہ الخ (یوسف ۱۰۰)

ترجمہ: "اور (شر میں داخل ہونے پر) اس نے اپنے والدین کو اٹھا کر تخت پر بٹھایا اور سب اس کے آگے بے اختیار سجدے میں جھک گئے" اور اس (یوسفؑ) نے کہا "اے ابا جان! یہ تعبیر ہے میرے اس خواب کی جو میں نے پہلے دیکھا تھا میرے رب نے اسے سچ کر دکھایا۔ اس نے بلاشبہ مجھ پر احسان فرمایا کہ مجھے قید سے نکالا اور آپ سب کو صحرا سے لا کر مجھ سے ملایا حالانکہ شیطان میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد ڈال چکا تھا..... بیشک وہ علیم و حکیم ہے۔"

منصوبہ ربانی اور قدرت کاملہ کی حیرت انگیز کرشمہ کاری بھی بے انتہا دلچسپ اور قابلِ غور ہے کہ یوسف علیہ السلام کے واقعہ کی ابتداء خواب سے ہوتی ہے اور انتہا خواب کی عملی تعبیر پر اور تمام واقعات جو ان کی زندگی کے نشیب و فراز میں حالات کی سازگاری اور چارہ سازی کے بے مثال نمونوں سے بھرپور ہیں، حیرت انگیز ترتیب و تسلسل سے رونما ہوتے رہے ہیں اور قاری کے سامنے ایک ایسے سنو آموز واقعہ کا نقشہ پیش کرتے ہیں جس میں یوسف علیہ السلام کا کردار انتہائی غیر متزلزل ہے اور صبر و استقامت کا بے مثال نمونہ ہے یوں تو عام لوگوں کے خواب میں سے بھی بعض میں بعض ہونے والے واقعات کی کبھی کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت ہوتی ہے لیکن ان میں سے اکثر و بیشتر یا تو شیطانی دوسے ہوتے ہیں یا انسانی فکر و تخیل کی کار فرمائی۔ البتہ نبیؐ کے خواب ہمیشہ ہی سچے ہوتے ہیں (وحی کی ایک شکل ہوتے ہیں) اور ربانی بشارت ہوتے ہیں، کبھی براہِ راست اور کبھی تمثیلی شکل میں۔ یوسف علیہ السلام کا خواب بھی حیرت انگیز تمثیلی انداز میں اللہ کی بشارت تھا، جس کو صرف اللہ کے نبی یعقوب علیہ السلام نے سمجھا (جس قدر اللہ نے چاہا) اور ان کے بیٹے، مستقبل میں ہونے والے نبیؐ نے اس پر پورا پورا اعتبار کیا، بالکل ایسے ہی جیسے کہ ابراہیم علیہ السلام نے بیٹے کو ذبح کرنے کا عجیب و غریب خواب بیان کیا تو ان کے نبیؐ بننے والے بیٹے اسمعیل علیہ السلام نے اس پر بھرپور اعتماد کیا اور اپنے آپ کو رضائے الہی کے تحت ذبح ہونے کے لیے پیش کر دیا۔ اللہ پر توکل اور اس کے نبیؐ پر اعتماد کے یہ واقعات بے حد نصیحت آموز ہیں اور ایمان باللہ کی یہ شان اس کے انبیاء اور صدیقوں (جیسے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ) کا ہی حصہ ہے اور قیامت تک ایمان کا ذوق رکھنے والوں کے لیے بیش بہا نمونہ۔

خاندانِ ابراہیمؑ کو بے مثال قربانیوں کے بعد اللہ تعالیٰ نے وہ عظمت و رفعت عطا فرمائی جو اپنی مثال آپ ہے، بالکل اسی طرح یوسف علیہ السلام کو خواب میں دی گئی بشارت کی تکمیل سے پہلے کس قدر صبر آزما اور حوصلہ شکن مراحل سے گزرنا پڑا اور وہ تمام مراحل میں ہر تسلیم خم ثابت قدم رہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے خواب کو حرف بحرف صحیح ثابت کر دکھایا۔ یہ اللہ کی اپنے خاص اور محبوب بندے کی مکرم کا بالکل ہی انوکھا اور فقید المثال انداز تھا جس کو قرآن میں "و خروا لہ السجنا" کہہ کر بیان کیا گیا ہے۔ یہاں یہ پہلو بھی قابلِ غور ہے کہ "چہرے پر بے رحمی ڈالنے سے بچائی کا واپس ہو جانا" یا یوسف علیہ السلام کے لیے سجدہ میں جھک جانا یہ ایسے واقعات ہیں کہ قرآن کی بجائے ان کا ذکر احادیثِ صحیحہ (بخاری و مسلم) میں ہوتا تو معتزلی فکر کے حاملین فوراً "یہ ان واقعات کو انکار حدیث کے لیے ہمان بنا لیتے اور ان احادیث کے خلاف پر زور انداز میں کتابچے چھپ جاتے۔ دراصل بے رحمی والے واقعہ کو نبیؐ کا معجزہ ہی سمجھنا چاہیے اور دوسرے واقعے کو درج بالا سطور کے مطابق اللہ کی طرف سے اس کے بندے کی مکرم قرار دینا چاہیے، پھر نہ تو کوئی اشکال ہو گا اور نہ قرآن و حدیث کے

انکار کی نوبت آئے گی۔ اب رہا یہ مسئلہ کہ غیر اللہ کو سجدہ کرنے کا کیا جواز ہے؟ کیا یہ دوسری شریعتوں میں جائز تھا؟ اس قسم کی قیاس آرائیوں کو اس غلط فہمی کی وجہ سے راہ ملی ہے کہ اس سجدہ کو صلوة میں مخصوص انداز میں کئے جانے والے۔۔۔۔۔ سجدہ کے ہم معنی قرار دے دیا گیا ہے۔ اور پھر یہ قیاس کر لیا گیا کہ شریعت محمدی میں غیر اللہ کو سجدہ حرام ہے لیکن دوسری شریعتوں میں سجدہ تقطعی جائز تھا یہ۔۔۔۔۔ سجدہ خواہ تقطعی ہو یا عبادتی غیر اللہ کے لیے قطعاً حرام ہے۔ شرکاذن فعل تو کسی بھی شریعت میں جائز نہیں ہو سکتا! ان قیاس آرائیوں اور موشگافیوں سے بچنے کا محتاط اور صاف ستھرا طریقہ یہ ہے کہ ”سجدہ“ کے لغوی معنی پر ذرا غور کر لیا جائے۔ سجدہ (یسجد) کے لغوی معنی ”ہما جزی و خاکساری کے ساتھ جھکنا“ ہے، ”تقیما“ کھڑے یا بیٹھے سر کو جھکانا بھی اس میں شامل ہے۔ یہاں ”خرو والد سجدا“ سے یہی تقیما ”جھکنا“ مراد ہے جو قدیم تہذیب میں تو عام رواج تھا اور آج کل بھی کہیں کہیں مشاہدے میں آتا ہے۔ وہ یہ معروف سجدہ جس میں ہاتھ اور گھٹنے زمین پر رکھ کر بیٹھنا کو مخصوص انداز میں زمین پر لگایا جاتا ہے یہ عبادت کے لیے مخصوص ہے اور غیر اللہ کے لیے حرام ہے اور کسی بھی شریعت میں اس کا جواز خارج از امکان ہے۔

الفرض یوسف علیہ السلام جو اس سبق آموز قصے کے مرکزی کردار ہیں اپنے عروج و کمال کی انتہا پر پہنچ کر جبکہ بدخوا اور شقی بھائی آپ کے سامنے سرنگوں ہیں، کبر و نخوت کے ساتھ ان پر طعن و تشنیع کے تیر برسانے کی بجائے عام معافی کا اعلان فرماتے ہیں اور اپنی طرف سے بھائیوں کی صفائی بھی پیش کرتے ہیں کہ شیطان نے ہمارے تعلقات میں رخنہ ڈال دیا تھا۔ پھر بھائیوں کی ظالمانہ بدسلوکی کی بھی احسن تاویل کرتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت و خفیہ تدبیر تھی جو مجھے اس مرحلہ تک پہنچانے کا سبب بنی۔ اس طرح عام دنیا پرست انسان کی روش کے برعکس اللہ تعالیٰ کے انعامات اور اس کی نوازشات کا عاجزانہ و مخلصانہ اعتراف فرماتے ہیں، ”علم تاویل حدیث اور دنیاوی عمدہ و منصب کو اپنی صلاحیتوں کا نتیجہ قرار دینے کی بجائے اللہ تعالیٰ کا عطیہ و انعام قرار دیتے ہیں۔ ابتداء سے انتقام تک مختلف مراحل میں رب کے احسانات کا ذکر فرماتے ہیں اور پھر شدید احساس بندگی سے سرشار جذبات کے ساتھ اظہار تفکر کرتے ہوئے التجاء کرتے ہیں ”اے میرے مالک، تو ہی میرا دنیا اور آخرت میں ولی و کار ساز ہے“ اپنی اطاعت و بندگی پر قائم رکھنا اور اسی پر موت دینا اور پھر اپنے صالح بندوں میں شامل کرنا“۔ قرآن کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

رب قدامتی من الملک و علمتی من تاویل الاحادیث..... والحقنی بالصلحین ○..... (یوسف ۱۰)

ترجمہ: ”اے میرے رب“ تو نے مجھے اقتدار عطا فرمایا، تاویل الاحادیث کا علم سکھایا۔ زمین و آسمان کے بنانے والے ”تو ہی دنیا و آخرت میں میرا ولی و سرپرست ہے“ میرا خاتمہ اسلام پر کرنا اور انجام کار صالحین میں شامل فرمایا۔“

غور فرمائیے! یہ اختتامی دعائیہ کلمات اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ نبی کے مخلصانہ جذبات تفکر کی کیسی موثر ترجمانی کرتے ہیں۔ سورۃ النمل میں سلیمان علیہ السلام اپنے اوپر اور اپنے والد داؤد علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ کے احسانات اور نوازشات کا ذکر کر کے عمل صالح پر استقامت اور رب کی رحمت و مغفرت کے طلبگار ہوتے ہیں۔ (سورۃ النمل آیت ۱۹)۔ یوسف علیہ السلام مالک الملک کے احسانات کو ذہن و خیال میں تازہ کر کے خشوع و خضوع کے ساتھ اعتراف نعمت اور اقرار ربوبیت کا اظہار فرماتے ہیں کہ بعد ”توفنی مسلماً والحقنی بالصلحین“ کے جامع ترین دعائیہ الفاظ پر انتقام فرماتے ہیں۔

۸۔ موعظت و نصیحت: جیسا کہ درج بالا سطور میں عرض کیا گیا قصہ یوسف کوئی افسانہ یا محض دل بھانے والی کہانی نہیں ہے یہ تو ایک غیر معمولی عبرت و نصیحت سے بھرپور ولولہ انگیز داستان عزیمت ہے جس کے اندر مناجات فکر و بصیرت کے لیے نصیحت و موعظت کے بیش بہا ذریعے اصول پنہاں ہیں جن کا ذکر مناسب موقعوں پر کر دیا گیا ہے۔ یہاں غلامی کے طور پر چند اہم پہلوؤں کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ اس کے مطالعے سے دو قسم کے کردار نکل کر سامنے آتے ہیں۔ ایک طرف آخرت کی جواب دہی سے بے نیاز خواہشات نفس کے پیچھے دوڑنے

والے ہیں (برادران یوسف اور مصری خواص و عوام) "تو دوسری طرف فکر آخرت سے سرشار پاک طینت و پاکیزہ سیرت مرد مجاہد کا کردار ہے۔ برادران یوسف بغض و حسد کے روگ میں مبتلا ہو کر اخلاق و انصاف ہمدردی و ترحم کے انسانی اوصاف سے بالکل ہی محروم نظر آتے ہیں ان کے نزدیک کامیابی کا انحصار صرف اس پر ہے کہ کسی طرح اعلیٰ صفات کے حامل فرشتہ خصلت سوتیلے بھائی کو ٹھکانے لگا کر اپنے والد کی تمام تر توجہ و التفات اور گھر میں خصوصی مقام حاصل کر لیں۔ ان کی ساری سعی و جہد صرف اسی کے لیے وقف ہے۔ پھر شرعی حلقہ میں وہ نام نہاد مذہب و متہدن معاشرہ ہے جو جنسی اختلاط و آزادی اور بے راہ روی سے بری طرح آلودہ ہے 'جہاں عوام و خواص کی زندگی کا مقصد صرف عیش و طرب اور خواہشات نفس کی تسکین ہے' اور ان کے نظام عدل اور معنی و جہد کا مرکز و محور اسی مقصد کا حصول ہے اور اپنے بے راہ روی کا شکار معاشرہ کی سفلی اقدار کے دفاع میں ایک بے خطا اور معصوم انسان کو بھرموں کے کسرے میں بھونک دینے میں عار محسوس نہیں کرتے!۔ اس کے برخلاف دوسری طرف ہمارے سامنے ایک جواں بہت و جواں سال پاک طینت مرد مجاہد ہے جو سوء حساب اور رب کے عذاب سے لرزاں ہے اور اللہ کی مشیت اور اس کی رضا پر پوری طرح راضی ہے 'وہ صبر استقامت اور حلم و اناة اور اعلیٰ اخلاق کا ایسا پیکر ہے کہ ہر قسم کے اعلیٰ مناصب و مراتب اور عیش و طرب اور نفسانی خواہشات کی بے پناہ شیطانی ترغیبات کو عزم و ارادہ کی چٹان بن کر بے نیازی سے ٹھکرا دیتا ہے۔ توکل علی اللہ اور تفویض الامور الی اللہ کے بعد قلب مطمئن کے ساتھ اپنے رب کے فیصلہ کا منتظر رہتا ہے۔ وہ باغی 'بد کردار' فحش کاری کے شکار معاشرہ کے رنگ میں رنگ جانے اور اللہ کی نافرمانی سے آلودہ معاشرہ کے دھارے میں بہ جانے کی بجائے "وب السجین احب الی....." کہہ کر زنداں کی صعوبتوں کو ترجیح دیتا ہے۔ وہ طاغوت پرستی کے نظام کے خلاف خود اپنی ذات میں ایک تحریک ہے جس کو قدم قدم پر اللہ تعالیٰ کی رہنمائی اور تائید و نصرت حاصل ہے اور رب کی مدد و نصرت پر اس کو بھرپور یقین ہے چنانچہ تمام صعوبتیں برضا و رغبت انگیز کر لینا اور باطل سے آنکھ ملا کر معاملات کی اصلاح کرنا اس کے لیے بالکل آسان ہو جاتا ہے۔ اس داستان عزیمت کے مطالعہ کرنے والے کو محسوس ہوتا ہے کہ پوری داستان اس کے مرکزی کردار یوسف علیہ السلام ہی کی تربیت کے سخت و جہاں غسل آزمائشی مراحل پر مشتمل ہے 'خواہ وہ آزمائشی رنج و الم اور شدائد و مصائب سے بھرپور چاہ کنعاں اور مصر کے زنداں کی شکل میں ہو یا عزیز مصر کے محل میں عیش و طرب و دولت و ثروت اور خواہشات کی تکمیل کے حسین و لقرب ذرائع و وسائل سے آراستہ شیطانی ماحول کی شکل میں 'ان تمام آزمائشی مراحل سے گذر کر یوسف علیہ السلام کی شکل میں ہمارے سامنے وہ قابل رشک آنیڈیل (نمونہ) ابھر کر آتا ہے جو مروت و جاہلت اور وقار کے ساتھ انتہائی پاکباز 'غیور' اعلیٰ اخلاق و کردار 'صبر و شکر' عزت نفس اور عزم و استقامت کا پیکر ہونے کے علاوہ بے انتہا ذکی و فہیم اور انتہائی پر اعتماد ہر امور مملکت کے تمام اوصاف حمیدہ سے متصف ہے 'یہاں تک کہ آخری مرحلہ میں جب اللہ تعالیٰ ان کو منصب اقتدار پر فائز فرماتا ہے تو اس وقت بھی وہ بدرجہ اتم حلم و اناة اور عفو و درگزر کی صفات سے متصف نظر آتے ہیں۔ جن شقی القلب بھائیوں کے ہاتھوں ناقابل تصور رنج و الم اور طعن و تشنیع کے تیرے سے تھے ان کو بلا تردد و تدبیر "لا تشریب علیکم الیوم....." کہہ کر تمام الزامات سے بری قرار دے دیتے ہیں۔ اور اس طرح قرآن کی آیت:

وَالْكَافِلِينَ الْغَضَبِ وَالْعَالِينَ عَنِ النَّاسِ (آل عمران: ۱۳۳)

(اور غصے کو پی جانے والے اور لوگوں کو محاف کر دینے والے) کے پوری طرح صدق نصرتے ہیں۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یہ واقعہ جس انداز سے اس سورۃ میں بیان کیا گیا ہے کئی دور کے حالات پر مبنی السطور ایک تبلیغ تبصرہ ہے اور دعوتی نقطہ نظر سے اپنے اندر چند اہم پہلو لیے ہوئے ہے۔ دعوت حق کی مخالفت میں قریش مکہ کا رویہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ کے ساتھ برادران یوسف کے رویہ کی طرح جاہلانہ و ظالمانہ تھا چنانچہ مخصوص انداز میں یہ واقعہ بیان کر کے پہلے ان پر یہ بات واضح کی گئی کہ آج ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس دین کی دعوت دے رہے ہیں وہ کوئی نیا نزلادین نہیں بلکہ وہی دین ابراہیمی ہے جس کی

دعوت یوسف علیہ السلام نے دی تھی پھر درج بالا طور کے مطابق وہ قسم کے کردار پیش کر کے بتایا گیا کہ ذرا آنکھ کھول کر دیکھ لو دین اسلام کو قبول کرنے والے اور آخرت کی جواب دہی کا احساس رکھنے والے رشتہ کے "محسن بندوں" کا اخلاق و کردار کیسا پاکیزہ ہوتا ہے اور اس کے برعکس آبا و اجداد کے جاہلانہ و مشرکانہ دین پر جسے رہنے والے آخرت سے بے پرواہ "تقلید اعمیٰ" پر مطمئن دنیا پرستوں کا کیا انداز ہوتا ہے۔ خود ہی مقابلہ کر کے دیکھ لو اب یہ اس دین کی حقانیت کا چلتا پھرتا ثبوت تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے "اس سے ہدایت و نصیحت حاصل نہ کرو گے تو اپنی بد انجامی اور ذلت و رسوائی کے تم خود ہی ذمہ دار ہو گے۔

اس قصہ پر غور و فکر کرنے سے یہ حقیقت بھی کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ اللہ کی مشیت و منصوبے کے مقابلے میں انسانی تدبیریں اور منصوبے کامیاب نہیں ہو سکتے خواہ ان کے پس پشت کیسی ہی طاقت اور کتنے ہی وسائل کیوں نہ ہوں۔ اللہ کے مشن کے خلاف اٹھنے والے انجام کار ذلت و رسوائی سے ہی دو چار ہو کر رہتے ہیں۔ چاہے ابتدائے دی گئی پھوٹ اور مہلت کو وہ اپنی کامیابی کیوں نہ سمجھیں۔ اس کے برعکس اللہ کے منصوبے اور مشن سے خود کو ہم آہنگ کر دینے والا پاک طینت مومن مادی وسائل کے بغیر بھی اپنے اعلیٰ اخلاق و کردار کی قوت اور رب کی فیسی تائید و نصرت سے تنہا ملک و قوم کو سحر کر سکتا ہے۔

یوسف علیہ السلام کا واقعہ جس مدلل و مؤثر انداز سے موعظت و نصیحت و حکمت سے بھرپور مسلسل و مربوط قصہ کی شکل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر جاری ہوا وہ خود اس بات کا بین ثبوت تھا کہ قرآن وحی ربانی ہے اور نبی علیہ السلام اللہ کے سچے رسول ہیں۔ اب قبول حق کا دار و مدار اگر صرف دلیل ہی پر ہو تو دلیل آجائے پر تو اس کو مان لینا چاہیے لیکن جس طرح اتفاق و انفس کے دلائل اور نبی کے معجزات کو انسانوں کی اکثریت بھٹلا دیتی ہے اسی طرح "ایام اللہ" یعنی تاریخی شواہد و دلائل کو بھی اکثر وہ مشرک لوگ بھٹلا دیا کرتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ تقلید اعمیٰ کا شکار انسانوں کی اکثریت شرک آورہ ایمان کی حامل ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو مومن سمجھتی ہے اور پوری بہت و دھرمی سے اس پر بھی رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ملاحظہ ہو:

○ وَمَلِیْمُنَ الْاَکْثَرُھُمْ بِاللہِ اِلَّا وھُمْ مُشْرِکُونَ..... (یوسف ۱۰۶)

ترجمہ: "ان میں سے اکثر اللہ کو مانتے ہیں مگر اس کے ساتھ دوسروں کو شریک بھی ٹھہراتے ہیں۔"

اب اس قصہ کے اختتام پر نبی علیہ السلام کو اس بات کو واضح کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے کہ آپ پورے عزم و اعتماد کے ساتھ اعلان کریں کہ آپ نے جس شعور و بصیرت کے ساتھ اس مشن کو نبھایا ہے اس کا تقاضہ یہ ہے کہ دعوت حق میں ذرا بھی ہدایت نہ ہو اور منکرین حق و مشرکین سے براءت کا اعلان کیا جائے چنانچہ فرمایا:

○ قُلْ ہٰذِہٖ سَبِیْلُ اللہِ عَلٰی بَصِیْرَۃِ اَنَا وَاَمِّنَ التَّجْعٰنِ ۙ وَ سَجَنَ اللہِ وَاَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ○..... (یوسف ۱۰۸)

ترجمہ: "تم ان سے کہہ دو کہ میرا راستہ یہ ہے کہ میں اللہ کی طرف بلا تا ہوں (پوری) بصیرت کے ساتھ اور میرے ساتھی بھی "اور اللہ پاک ہے شرک کرنے والوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں"

اللہ کے نبی کا مشن اللہ کی طرف بلا تا اور ایک اللہ کی بندگی کی دعوت و دعا ہے وہ اس مشن کو پوری بصیرت کے ساتھ اختیار کرتا ہے نہ کہ تقلیدی طور پر "اور نبی" کے متبعین بھی حق کو بصیرت کی سطح پر پا رہے ہیں اور پورے شعور کے ساتھ "وہ ان ویرہان کی روشنی میں اس کو مان کر اس مقدس مشن کا ساتھ دیتے ہیں۔ خوش نصیب ہیں وہ اولوالالبصار جو اس پکار پر لبیک کہیں اور عزم و صبر کے ساتھ اس قافلہ رہ حق کے ہم سفر بن جائیں "اس داستان عزیمت میں ایسے ہی ہواں بہتوں کے لیے موعظت اور تربیت و تزکیہ کا سامان ہے۔

جاگنے کی راتیں

مشورہ سلطان

اللہ تعالیٰ کے مخلص و متقی بندے جو پورے شعور کے ساتھ ایمان کا اقرار کر کے اپنے رب کی بندگی کا عزم کرتے ہیں، فرائض کی پابندی کے ساتھ ساتھ تقرب الہی کے لیے نوافل کا بھی اہتمام کرتے ہیں تاکہ قبولیت کے مخصوص اوقات میں بارگاہ رب العزت میں غفور و مغفرت کی خصوصی التجا کر سکیں۔ قرآن میں ان کے انداز بندگی اور مومنانہ اوصاف کا تذکرہ جگہ جگہ کیا گیا ہے۔ سورۃ آل عمران میں فرمایا کہ وہ ”صابر و صادق اور قانت و متق“ ہوتے ہیں اور ایک خصوصی صفت یہ بیان کی گئی کہ وہ ”مستغفرین بالاسحار“ یعنی رات کے پچھلے حصے میں استغفار کرنے والے ہوتے ہیں۔ (آل عمران ۷۷)

سورہ فرقان اور الم سجدہ میں ان کا ذکر بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ فرمایا گیا۔

وَالَّذِينَ يَبِيتُونَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَقِيَامًا..... (الفرقان ۲۳)

تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا..... (الم سجدہ ۱۶)

یعنی ان کی راتیں بارگاہ رب ذوالجلال والا کرام میں قیام و سجدہ ریزی کرتے ہوئے گزرتی ہیں۔۔۔ ان کے پہلو آرام وہ بستر سے علیحدہ رہتے ہیں۔۔۔ اب ظاہر ہے کہ رحمن کے ان صالح بندوں کا یہ عمل محض ایک یا دو راتوں کے لیے تو مخصوص نہیں ہوتا بلکہ وہ تو تمام سال ”ذکر اللہ خالیاً فضا صفت عیناً“ (ختمی میں اللہ کی یاد ہو اور آنکھیں اشکبار) کا نمونہ پیش کرنا چاہتے ہیں چنانچہ ان کی تو ہر رات ہی جاگنے کی رات ہوتی ہے لیکن بلاشبہ کچھ مخصوص راتیں ایسی بھی ہیں جن میں قیام و رکوع و سجود کی فضیلت بہت زیادہ بتائی گئی ہے مثلاً ”رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتیں“ جن کی فضیلت میں بے شمار صحیح روایات موجود ہیں اور ان راتوں میں پوری پوری رات جاگنے اور عبادت کرنے کی ترغیب و تاکید ملتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا ان کے علاوہ بھی ایسی فضیلت والی راتیں ہیں جن کا خصوصی اہتمام قرآن و حدیث سے ثابت ہو۔

ہر سال رجب و شعبان کے مہینوں میں کچھ ایسی راتیں آتی ہیں جب لوگوں کے والہانہ جوش و خروش کو دیکھ کر بعض سنجیدہ ذہنوں میں ان راتوں کی حیثیت کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ دراصل یہ حق کے حلاشی وہی لوگ ہوا کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ عقل و فراست کو تحقیق حال کے لیے پوری طرح استعمال کرتے ہیں نہ کہ وہ اندھے گیر کے فقیر جو ہر ”امام اور پیر“ کی بات کو بے دریغ قبول کر لیں۔ قرآن کی نظر میں یہ ”اعنی“ ہیں اور وہ ”اولوالالباب“ (المائدہ ۱۰) دوسری جگہ ان کی نشاندہی اس طرح کی گئی ہے۔

وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَعَمِيَانًا..... (الفرقان ۷۳)

(جب انھیں اپنے رب کی آیات کے ذریعے نصیحت کی جاتی ہے تو وہ ان پر اندھے بہرے ہو کر نہیں گر پڑتے)

یعنی اپنی عقل و فہم کو استعمال کر کے دیکھتے ہیں کہ مشرکانہ افعال و بدعات کی تائید میں پیش کی جانے والی آیات و روایات میں کہیں لفظی و معنوی تحریف تو نہیں کی گئی یا گھڑی ہوئی روایات و نام نہاد ہزرگوں کے اقوال کو جو قرآن و حدیث سے متصادم ہیں، احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم بنا کر پیش تو نہیں کر دیا گیا۔ اس علمی جائزے سے پہلے ذرا یہ بھی دیکھ لیا جائے کہ ان راتوں میں ہوتا کیا ہے۔ ان راتوں میں عوام الناس جاگنے کا خاص اہتمام و التزام کرتے ہیں، عبادت گاہوں کو غروب سجایا جاتا ہے، وعظ کی محفلیں برپا ہوتی ہیں جن میں مقررین پر در ذور بیان ان راتوں کی فضیلت و اہمیت بیان کرنے میں صرف کر دیتے ہیں، اگلے دن روزہ بھی رکھا جاتا ہے اور اس کی بے انتہا فضیلت بیان کی جاتی ہے۔ ان مواقع پر ایسے پمفلٹ اور کتابچے بھی تقسیم کئے جاتے ہیں جن میں قرآن کی مخصوص سورتوں کے ساتھ توافل ادا کرنے کی تراکیب و انداز سکھائے جاتے ہیں اور ان کے بے شمار فوائد بیان کئے جاتے ہیں، ساتھ ہی دیگر اذکار و اشغال اور صلوٰۃ التہجد وغیرہ کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ اخبارات بھی خصوصی ایڈیشن شائع کر کے اس ”کارِ ثواب“ میں بیڑہ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں جن میں ان مواقع کے مطابق ”اہل علم“ حضرات کے مضامین چھپتے ہیں۔ اگلے دن درس گاہیں بند رہتی ہیں۔ نہ جانے یہ قوم پڑھنے لکھنے اور کام کرنے سے کیوں ہی چراتی ہے، خواہ جائگنے کی کوئی ایسی رات آئے تو چھٹی، کسی کا یوم ولادت یا وفات ہو تو چھٹی، بارش ہو جائے تو چھٹی یا کوئی ایسی غیر معمولی بات ہو جائے تو چھٹی، حتیٰ کہ کسی بڑے کھیل میں کامیابی حاصل ہو تو بھی چھٹی۔ الغرض گرون ہر صورت میں بیچاری تعلیم ہی کی ہاتھ آتی ہے۔ جب تعلیم کو ایسی گئی گزری چیز سمجھ لیا جائے کہ آئے دن بات بے بات چھٹی پر چھٹی ہوتی رہے تو پھر اصلاح قوم اور معیار تعلیم کا تو بس اللہ ہی حافظ! ایسا شوق و لگن پھر کہاں سے آئے کہ کتابوں میں سرکھپا کر تحقیق و جستجو کر کے حق بات کو تلاش کیا جائے

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے
کہاں سے آئے صد اے لا الہ الا اللہ

بہر حال، ناامیدی پھر بھی مناسب نہیں، اصلاح احوال کی ضرورت کے پیش نظر حق کے متلاشیوں کو چراغ دکھانے کی سعی کے طور پر ضروری محسوس ہوا کہ قرآن و حدیث کی روشنی میں ان مروجہ مقدس راتوں کی حیثیت واضح کی جائے۔ ہر چند کہ ان مواقع پر اہل حق ہمیشہ ہی حقیقت حال کو بیان کرتے رہے ہیں لیکن ان کے اجتماعات کی تقاریر سب لوگوں تک نہیں پہنچ پاتیں اور بہت سے لوگ لاعلم اور تھکنہ جاتے ہیں، چنانچہ اس مضمون کے ذریعے ایسے ہی لوگوں کی پیاس بجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ تحریر تقریر سے زیادہ مفید اور دیرپا اثرات کی حامل ہو ا کرتی ہے۔

شب معراج

یہ رات رب کی مہمیسویں تاریخ کو معراج کے عظیم واقعہ کے حوالے سے منائی جاتی ہے، جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کے ایک قلیل حصے میں بھنگہ مکہ سے بیت المقدس اور پھر وہاں سے سات آسمانوں میں ہوتے ہوئے سدرۃ المنتہی تک پہنچ کر اپنے رب سے ہم کلامی کا شرف حاصل کیا۔ اس واقعہ کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس طرح فرمایا:

سُبْحٰنَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعِبْدِہٖ لِیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْقُصْبِی الْمَذٰیرَ الَّذِیْ دَارَکُنَا
حَوْلَہُ لَنَرِیْمَعْنِ اٰیٰتِنَا... (نہی اسرائیل)

(پاک ہے وہ ذات جو ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے اس مسجد اقصیٰ لے گئی جس کے گرد ہم نے برکت دی ہے تاکہ اسے ہم اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔)

سورہ نجم میں قاب قوسین و سدرة المنتهى وغیرہ کے ذکر کے بعد فرمایا۔

لقد راى من آيات ربه الكبرى

(بھگ اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں)

صحابہ حنین کی معراج والی روایت میں اس واقعہ کی کافی تفصیل بیان ہوئی ہے، 'مجملاً' بنی علیہ السلام نے تمام انبیاء علیہم السلام کی مسجد القصیٰ میں ایک صلوٰۃ میں امامت فرمائی، وہاں سے جبرئیل علیہ السلام کی معیت میں براق کے ذریعے آسمانوں پر تشریف لے گئے۔ آسمانوں پر مختلف انبیاء سے ملاقات کی یہاں تک کہ سدرة المنتهى (پہری کے درخت) تک پہنچے، پانچ وقت کی صلوٰۃ فرض ہوئی وغیرہ وغیرہ (مشکوٰۃ باب معراج) مسلم کی کتاب الایمان اور بخاری کی کتاب التفسیر میں مروی احادیث سے اس مسئلہ کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے کہ اس موقع پر رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیلؑ کو ہی دیکھا تھا نہ کہ اللہ تعالیٰ کو (یہ کہنا کہ نبی علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا صریحاً قرآن و حدیث کے خلاف ہے)۔

یہ بات قابل غور ہے کہ یہ عظیم رات آج سے تقریباً 'چودہ سو اٹھارہ' (۱۳۱۸) سال قبل واقع ہو چکی، اب ہر سال تو پچیسویں (۲۰۲۱) رجب کو رات نہیں آتی۔ احادیث و آثار صحابہؓ سے بھی ایسی کوئی بات ثابت نہیں کہ ہر سال اس رات کی یاد منائی گئی، مساجد کو سجایا گیا، چراغاں ہوا، شب بیداری کی گئی اور اگلے دن روزہ بھی رکھا گیا۔ ماہ رجب زمانہ جاہلیت سے اشھر حرام میں شامل ہے، یعنی ایسے مہینے جن میں عرب قبائل جنگ و جدال سے دور رہتے اور زیارت کعبہ کرتے۔ اس سے زیادہ کوئی فضیلت ماہ رجب کی ثابت نہیں۔ ایسی تمام روایات بے اصل ہیں جن میں رجب کو اللہ کا مہینہ بتایا گیا ہے، اس کے سات روزوں پر جہنم کے ساتوں دروازے بند اور آٹھ روزوں پر جنت کے آٹھوں دروازے کھل جانے کی خوشخبری دی گئی ہے، تیرہویں کے روزے کا ثواب تین ہزار اور چودھویں کا دس ہزار سال کے روزوں کے برابر بتایا گیا ہے، کسی ایک دن کے روزے کا ثواب ایک ہزار برس کے روزوں کے برابر بتایا گیا، ایک رات کی شب بیداری ایک سال کی عبادت کے برابر بتائی گئی ہے، نیکیوں اور گناہوں کا بدلہ دو گنا دینے کی بات کی گئی ہے، جنت کا ایک دروازہ رجب کے روزے رکھنے والوں کے لیے مخصوص بتایا گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ دراصل ان میں سے اکثر فضائل تو صحیح احادیث میں رمضان کے روزوں سے متعلق وارد ہوئے ہیں۔ ابو داؤد نے کتاب الصوم میں نقلی روزوں کے باب میں عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول رجب کے روزوں کے بارے میں نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس ماہ میں اتنے روزے رکھتے ہم کہتے کہ اب آپ انظار (یعنی نادمہ) ہی نہ کریں گے اور کبھی رکھنا چھوڑ دیتے تو اس قدر کہ ہم کہتے کہ اب آپ روزہ نہ رکھیں گے۔ ابن ماجہ نے بھی کتاب الصوم میں یہ روایت نقل کی ہے لیکن اس میں مہینے کا ذکر نہیں ہے۔ ابن عباسؓ کی مذکورہ بالا روایت کے الفاظ بعینہ بخاری و مسلم نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے شعبان کے لیے نقل کئے ہیں۔

اس رات میں مختلف بدعات کے ساتھ گستاخی رسول صلی اللہ علیہ وسلم و اہانت باری تعالیٰ کے مجیب لڑنے خیر متاخر دیکھنے میں آتے ہیں مثلاً "بعض بگوسوں پر بورڈ لکھے نظر آتے ہیں ع شاہ دولہا بنا آج کی رات ہے۔ کس قدر شہنشاہ و قہج، مکروہ و گھناؤنا کلام ہے یہ، معاذ اللہ! (نقل کفر نہ باشد) کیا یہ گستاخ، اپنی جانوں پر بے پایاں ظلم کے مرتکب یہ کہنے کی جسارت کر رہے ہیں کہ نبی کی اپنے رب کی طرف معراج گویا ان کے نزدیک دولہا کا دلہن کے ہاں جانا ہے!!" استغفر اللہ العظیم و نعوذ بہ من الشیطن الرجیم۔ اس رات سے کچھ روز پہلے یعنی ۲۲ رجب کو جعفر صادق کے نام کے کوٹڑے بھی بھرے جاتے ہیں، درآں حایکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں چار جگہ غیر اللہ کے نام کی نذر کو حرام قرار دیا ہے (البقرہ: ۲۳، المائدہ: ۳، الانعام: ۱۳۶، النمل: ۱۵) چنانچہ قرآن و حدیث کی رو سے غیر اللہ کی نذر و نیاز شرک اور اس کا کھانا حرام ہے۔ اب یہ کرنے والے اس کی وجہ کچھ بھی بتائیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ۲۲ رجب کو صحابی رسول (جو کاتب وحی بھی رہے) خلیفۃ

المسلمین معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی تھی جس کی خوشی میں ان کے مخالفین نے میٹھی نکلیاں تقسیم کیں اور بنو امیہ کے حکمران کے خوف سے خفیہ طور سے پکائی اور کھلائی گئیں۔ بنو امیہ کے دشمن شیعہ لوگ آج بھی ہر سال اس دن خوشیاں مناتے ہیں 'نیا نیاں کرتے ہیں اور سنی فرقہ کے افراد بھی لاعلمی میں ان کی اتباع کرتے ہوئے ایک صحابی رسول کی وفات پر خوشیاں مناتے ہیں۔

شب براءت

چودہ (۱۴) شعبان کو شب براءت منانے والوں میں شیعہ 'سنی (بریلوی، دیوبندی) وغیرہ تقریباً 'سب ہی شامل ہیں 'اور اس رات کا سب سے زیادہ اہتمام ہوتا ہے چنانچہ بدعات کا ارتکاب بھی زیادہ ہی ہوتا ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ ان کے ثبوت و جواز کے لیے آیات قرآنی و احادیث میں تحریف کی جاتی ہے 'وی کام کیا جاتا ہے جس پر مسودوں کی پکڑ کی گئی ہے یعنی

...بحرفون الکلم عن مواضع... الخ (النساء: ۴۶)

(کلمات کو ان کی جگہ سے بدل دیتے ہیں)

یہ اپنی ایجاد کردہ شب براءت کے تقدس اور اس کی اہمیت کے ثبوت کے لیے سورہ خان کی آیات جن کا صریحاً 'اطلاق' 'لیلۃ القدر' پر ہوتا ہے 'ان کو من گھڑت روایات کی بنیاد پر شب براءت پر چسپاں کیا جاتا ہے اور پھر اس باطل موقف و نظریے کی تائید و اشاعت کے لیے مضامین و کتابچے چھاپے اور تقسیم کئے جاتے ہیں جن میں مختلف فضائل بتا کر لوگوں کو خلاف سنت کاموں پر اکسایا جاتا ہے۔ یہاں بطور نمونہ ۵ جنوری ۱۹۹۶ء کے روزنامہ جنگ 'کراچی میں شائع ہونے والے مولوی تھانوی اور صوفی دیوانی کے مضامین اور الیاس قادری کے کتابچے برائے شعبان بعنوان 'جنتی اونٹنی' پر کچھ تبصرہ پیش کیا جاتا ہے۔

مولوی موصوف نے اپنے مضمون میں ترمذی کی ایک روایت (جس کی حیثیت آگے بیان کی جائے گی) کے علاوہ کسی روایت کا کوئی حوالہ نہیں دیا اور بے سند و لا اصل روایتوں کی بناء پر شب براءت کی فضیلت کا طومار باندھ دیا۔ اور وہ حوالہ لاتے بھی کہاں سے 'اس رات کا تو صحیح احادیث میں کوئی تذکرہ ہی نہیں 'البتہ صوفیوں کی کتابوں میں اس کا ذکر ضرور ملتا ہے جو اسی طرح کے کذب و افتراء سے بھری ہوئی ہیں۔ موصوف فرماتے ہیں کہ اس رات کو لیلۃ البیراۃ 'لیلۃ الحبائیر' کہ 'لیلۃ القدر' حقیقۃً لیلۃ العسک کہا جاتا ہے۔ اب کوئی ان سے پوچھے کہ جناب کسی صحیح حدیث میں تو ایسی کسی رات کا ذکر نہیں جس کے یہ نام ہوں۔ دراصل شب براءت ہی کو معرب کر کے یہ کارنامہ انجام دیا گیا ہے ورنہ عرب ممالک میں تو اس کا وجود نہ تھا 'اس کی تو جہم بھومی مجوسیوں کا ملک فارس تھا اور انہوں نے بنو عباس کے دور میں اقتدار پر تسلط حاصل کرنے کے بعد اپنے قدیم آتش پرستانہ عقائد و رسوم کو Intermix کرنے یعنی اسلامی بنانے کی کوشش کی تھی 'اور اس رات آتش بازی کر کے انہوں نے اپنی دیرینہ خواہش بھی پوری کر لی۔ آتش بازی ایسا شیطانی مذسوم فعل ہے کہ تمام سلیم الفطرت افراد اس کی مذمت کرتے ہیں لیکن یہ ایرانی مجوسی جنہوں نے اسلام کا لبادہ اوڑھ کر ایک طبعیہ فرقہ بنا لیا ہے 'اس فعل شنیع میں بوجہ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ یہ لوگ اس دن اپنے خود ساختہ بارہویں امام کی پیدائش کا جشن مناتے ہیں 'کراچی میں نیو جیلیٹی (Native Jelly) کے پل پر اس رات اس فرقے کے لوگوں کا اثر و حام ہوتا ہے 'وہ کاغذ کی پرچیوں پر اپنی عرضیاں لکھ کر آٹے میں لپیٹ کر سمندر میں ڈال دیتے ہیں جو ان کے مزاحمہ عقائد کے مطابق اس روپوش امام تک پہنچ جاتی ہیں اور وہ گویا ان کی مرادوں کو پورا کر دیتے ہیں۔ کیا یہ دین کے نام پر توہم پرستی کی بدترین شکل نہیں؟

الغرض مولوی موصوف نے اس رات میں جاگنے اور عبادت کرنے کو سنت قرار دیا اور فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم نقل کیا کہ 'اس رات جس نے اللہ کی عبادت کی 'دوبارہ الہی میں اس کی ہر دعا قبول ہوتی ہے خواہ وہ اپنی بلندی اور وسعتوں کے اعتبار سے پہاڑوں کے برابر ہی کیوں نہ ہو۔' غور فرمائیے کہ صحابہ کرام جو نیکی کے حریص تھے ایسے قیمتی موقعہ کو کس طرح ضائع کر سکتے تھے! لیکن کسی ایک صحیح روایت

میں بھی یہ نہیں ملتا کہ صحابہ میں سے کسی نے اس رات شب بیداری کی ہو اور رات بھر عبادت کرتے رہے ہوں۔ موصوفہ رقمطراز ہیں کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

”اٹھو ماہ شعبان کی چند راتوں میں شب کو کیونکہ یقینی طور پر یہ رات مبارک ہے۔ اس میں رحمت الہی صبح تک آسمان

دنیا پر جلوہ گر ہو کر یہ صدا دیتی ہے کہ کوئی ہے اس جنس کا خریدار جو دامن پھیلانے اور مرادوں سے بھر کر لے جائے جو نعمت کے آنسو بہائے اور صلہ میں گہرائے رحمت حاصل کرے جو بیماری سے نجات کا طلب گار ہو اور شفا یاب ہو جو آسودہ حالی کا متمنی اور رزق میں کشادگی اور برکتوں سے بہرہ ور ہو“

آگے جا کر یہی قول رسول صلی اللہ علیہ وسلم انہوں نے تھوڑے فرق کے ساتھ علی رضی اللہ عنہ سے بھی نقل کیا۔ صوفی جیلانی اپنے مضمون میں اس موقعہ کے متعلق لکھتے ہیں۔

”شب براءت میں اللہ تعالیٰ آسمان دنیا پر نزول اجلال فرماتا ہے اس کی رحمت واسعہ کی چادر ساری دنیا پر چھا جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ اپنی بندہ نوازی کی شان کریمی کے ساتھ اعلان فرماتا ہے: ہے کوئی مغفرت چاہنے والا گنہگار بندہ کہ میں اس کے گناہ معاف کروں؟ ہے کوئی رزق کا طلب گار بندہ کہ میں اسے رزق و روزی عطا کروں؟ ہے کوئی مصیبت اور پریشانی میں مبتلا کوئی بندہ کہ میں اسے راحت و صحت اور عافیت عطا کروں؟۔ اللہ تعالیٰ کے ایسے ہی خطابات رحمت سے بندے اس رات سرفراز کئے جاتے ہیں یہاں تک کہ سحر طلوع ہو جاتی ہے“

اس کے برعکس صحیح احادیث سے تو ثابت ہے کہ یہ صورت حال سال میں کسی ایک رات کے لیے مخصوص نہیں بلکہ ہر رات کے آخری حصہ میں اللہ تعالیٰ کے آسمان دنیا پر نزول اور دعاؤں کی قبولیت کی حیرت ساعہ کا ذکر روایات میں موجود ہے۔ اس سلسلہ میں پوری روایت ملاحظہ ہو۔

”و عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یُنزل ربنا تبارک و تعالیٰ کل لیلۃ الی السماء الدنیا حسین یمقی ثلث اللیل الآخر یقول من یدعونی فاستجب لہ من یمسألنی فاعطیہ من یتستغفرنی فاعفّر لہ“ (متفق علیہ)

ترجمہ: (ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہمارا رب تبارک و تعالیٰ آسمان دنیا پر ہر رات نزول فرماتا ہے جبکہ باقی رہتی ہے ایک تنہائی رات اور فرماتا ہے ”کوئی ہے جو دعا کرے کہ میں اس کی دعا قبول کروں جو مجھ سے مانگے میں اسے عطا کروں کوئی مجھ سے مغفرت چاہے اور میں اس معاف کروں“)

غور فرمائیے جن روایات کی بنیاد پر اس رات کی فضیلت کی عمارت استوار کی گئی تھی ان کو تو بخاری و مسلم کی روایت نے بے حیثیت ثابت کر دیا! اس کے علاوہ ایک روایت میں اسامہ رضی اللہ عنہ سے فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی نقل کیا گیا ہے کہ:

”یہ بہت ہی مبارک مہینہ رجب اور رمضان کے درمیان واقع ہوا ہے جس سے لوگ غافل ہیں۔ اس ماہ میں انسانوں کے اعمال کو رب جلیل کے حضور پیش کیا جاتا ہے لہذا میں اس ماہ کو بے حد محبوب رکھتا ہوں تاکہ میرے اعمال میرے رب کے سامنے پیش ہوں تو اس وقت مجھے روزہ سے ہونا چاہیے“

یہ روایت بھی صحاح میں نہیں ملتی بلکہ یہ صحیح روایات کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اعمال پیش ہونے کا ذکر خصوصیت کے ساتھ شب براءت میں نہیں بلکہ ہر چہر اور جمعرات کو ملتا ہے (مسلم) چنانچہ ان دو دنوں میں نبی علیہ السلام روزہ رکھتے اور فرماتے کہ ”ان دنوں میں اعمال اللہ کی بارگاہ میں پیش ہوتے ہیں اور میں پسند کرتا ہوں کہ جب میرے اعمال پیش ہوں تو میں روزے سے ہوں“ (ترمذی)۔

موصوف مزید فرماتے ہیں کہ "ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق شعبان کی پندرہویں شب کو مسلمانوں کی ارواح مقدسہ اپنے اپنے گھروں کو واپس جاتی ہیں اور اپنے اپنے وارثوں سے کہتی ہیں..... "مقام حیرت ہے کہ قرآن و حدیث پر ایمان کے وحمید اور بنود اور قدیم بت پرستوں کے عقیدہ تنازع کے مطابق عقیدہ اپنائے ہوئے ہیں جو صراحتاً "خلاف قرآن ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے۔"

...انہم الیہم لا یرجعون..... (الحج: ۳۱)

ترجمہ : "وہ (مرنے والے) ان (دنیا والوں) کی طرف (کبھی) نہیں لوٹ سکتے"

...ثم انکم یوم القیامۃ تبعثون..... (المومن: ۶۶)

ترجمہ : "پھر تم قیامت کے دن ہی اٹھائے جاؤ گے"

دنیا ہی میں (مردہ لاشے میں) اعادہ روح کا عقیدہ قرآن و صحیح احادیث کے صریحاً خلاف اور شرک کی جز ہے۔ اسی شرک کا عقیدے کی بنیاد پر تو قبر میں مدفون ہستیوں کو زندہ قرار دے کر "سنتا اور بودا" سمجھا جاتا ہے لوگ انھیں (مخاطب کر کے) سلام کرتے ہیں، دور سے سلام بھیجتے ہیں، دوسروں کے کہے ہوئے سلام براہ راست مخاطب کر کے پہنچاتے ہیں، گویا کہ وہ سب کچھ سن رہے ہیں، پھر ان سے دعاؤں اور سفارش کی التجائیں کی جاتی ہیں۔ بعض خالی عقیدت مند تو انھیں (مدو کے لیے) پکارنا اور ان کی دہائی دینا شروع کر دیتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہی سارے کام تو شرک کرتے رہے ہیں اور قرآن و حدیث اس پر گواہ ہیں۔ اسی باطل عقیدہ کی بنیاد پر ان کے قبر سے نکل آئے، خوابوں میں آئے اور عالم بیداری میں مافوق الاسباب کارہائے نمایاں انجام دینے کے ان گنت قہرے گھڑائے گئے ہیں۔

اس سلسلہ میں ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت بھی بیان کی گئی ہے کہ

"ایک رات میری آنکھ کھلی تو میں نے نبی علیہ السلام کو بستر پر پایا۔ میں انھیں تلاش کرنے باہر گئی تو وہ منہ کی قبرستان میں نظر آئے۔ فرمایا کہ میرے پاس جبرئیل امین آئے تھے اور انہوں نے کہا کہ آج نصف شعبان کی رات ہے اس میں قبرستان جا کر مردوں کے لیے دعائے مغفرت کرو۔ آج کی رات اللہ ہو کلب کی بکریوں کے بالوں سے زیادہ لوگوں کی مغفرت فرماتا ہے"

ترمذی کی اس حدیث کو بنیاد بنا کر لوگ اس رات قبرستان جاتے ہیں، قبروں پر چادریں چڑھاتے ہیں، اگر بقیاں اور شمعیں روشن کرتے ہیں، پھول ڈالتے ہیں، ہاتھ اٹھا کر دعائیں کرتے ہیں، اس طرح شرک و بدعات کا ایک طوفان باندھتے ہیں اور یہ سب سنت سمجھ کر ہی کیا جاتا ہے، اکاش اس روایت کو پیش کرنے والے اس کی حیثیت پر غور کر لیتے، کم از کم محدث کے تبصرے پر ہی نظر ڈال لیتے۔ امام ترمذی کہتے ہیں کہ عائشہؓ کی حدیث کو ہم اسی سند سے جانتے ہیں یعنی حجاج کی سند سے، اور میں نے امام بخاری سے سنا کہ وہ اس حدیث کو ضعیف کہتے تھے اور فرماتے تھے کہ یحییٰ بن ابی کثیر نے عروہ بن الزبیر سے نہیں سنا ہے اور حجاج بن ارطاة نے یحییٰ بن ابی کثیر سے نہیں سنا ہے۔ (ترمذی کتاب الصوم) صحیح مسلم میں کتاب الجنائز کے آخر میں اس سے کچھ ملتی جلتی ایک روایت ہے جس کے مطابق ام المؤمنین عائشہؓ موسیقی نہ تھیں بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم انھیں سوتا خیال کر کے، قہقہے چلے گئے تھے، اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ جبرئیل نے آکر بتایا کہ اللہ نے حکم دیا ہے کہ تمہیں جا کر مغفرت کی دعا کریں۔ عائشہؓ نے دعا دریافت کی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا بتائی۔

السلام علی اہل الدیار من المؤمنین والمسلمین یرحم اللہ المستغنیین منا
والمستأخرین وانا انشاء اللہ بکم للاحقون

ترجمہ : اے مومنوں اور مسلموں کے گھر والو! تم پر سلامتی ہو، اللہ تعالیٰ ہم سے اگلے اور پچھلے لوگوں پر رحم فرمائے اور ہم انشاء اللہ تم سے ملنے والے ہیں۔

اس روایت میں مینے اور دن کا کوئی ذکر نہیں اور اس کے ساتھ کی دوسری روایتوں سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ قبرستان جانے کے لیے پندرہویں شعبان کی کوئی تخصیص نہیں۔ مقام غور ہے کہ قرآن اور صحیح احادیث نے مشرکانہ و افعال کا قلعی سد باب کر دیا تھا لیکن ان مقام پر ست احبار و رہبان نے ضعیف و منکر روایات کی بنیاد پر ان کو جاری کر دینے کی مہم زور شور سے شروع کر رکھی ہے۔ بدعات و خرافات کو دین کا جزو لاینفک بنا دیا ہے۔ قبرستان میں جا کر قبروں پر پھول، کیوڑہ، خوشبوئیاں چھڑکنا، چادر چڑھانا، چراغاں کرنا، اس قسم کے جاہلانہ و مشرکانہ کاموں کو شعائر اسلام سمجھا جانے لگا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تو قبروں پر چراغ جلانے والوں پر لعنت فرمائی ہے (بخاری، کتاب الجنائز)۔ قبریں عبادت کی نہیں عبرت کی جگہ ہیں۔ ان کی زیارت کی اجازت اس لیے دی گئی ہے کہ انسان کو آخرت کا احساس ہو نہی نے فرمایا کہ "فانها ترهده في الدنيا وتذكر الاخرة" (یہ دنیا سے بے رغبتی پیدا کرتی اور آخرت یاد دلاتی ہے) (ترمذی)۔ کتاب الجنائز) دوسری جگہ آپ نے فرمایا "انها تذکر الموت" (یعنی یہ (قبرستان جانا) موت یاد دلاتا ہے۔ (مسلم، کتاب الجنائز) اب ظاہر ہے کہ یہ مقصد خوشبوئوں سے معطر، پھولوں سے لدے ہوئے، روشنی سے معمور فن تعمیر کے مرمریں شاہکاروں پر زن و مرد کے جم غفیر کی موجودگی میں تو حاصل ہونے سے رہا، یہ تو بے گل و بے چراغ سنسان یکجہ قبروں سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لیے کسی مسلم کی قبر کی خصوصیت نہیں بلکہ عبرت کے لیے کسی مشرک کی ویران قبر پر بھی جاسکتے ہی چنانچہ صحیح مسلم، نسائی و ابن ماجہ وغیرہ کتاب الجنائز میں ابو ہریرہ سے روایت لائے ہیں اور نسائی و ابن ماجہ نے اس پر باب قائم کیا ہے یعنی "مشرکوں کی قبروں کی زیارت کا باب"۔ اس روایت میں ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی والدہ کی قبر پر گئے تو رونے لگے اور جو صحابہ آپ کے ساتھ تھے وہ بھی روئے۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے اپنے رب سے ماں کے لیے دعائے مغفرت کی اجازت طلب کی، اس کی اجازت نہ ملی (کیونکہ مشرک کے لیے دعائے مغفرت کرنا جائز نہیں) پھر میں نے ان کی قبر پر جانے کی اجازت مانگی تو اس کی اجازت مل گئی، میں تم بھی قبروں پر جایا کرو اس لیے کہ یہ موت یاد دلاتی ہے۔" احادیث مجھ کے برعکس آج کل جو کچھ اس رات میں کیا جاتا ہے یہ اہتمام تو قرون اولیٰ میں کسی ایک روایت سے بھی ثابت نہیں۔ بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پختہ قبریں بنانے اور ان پر گنبد وغیرہ تعمیر کرنے (اس کو زیب و زینت دینے) اور وہاں (مجاورین کر) بیٹھنے سے شدت سے منع فرمایا ہے اور آپ کو یہی قبروں کو زمین کے برابر کر دینے کا حکم دیتے تھے (ترمذی، مسلم، کتاب الجنائز) علاوہ ازیں موصوف نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی یہ روایت بھی بیان کی ہے کہ نبی علیہ السلام اس موقع پر یہ دعا مانگا کرتے تھے۔

"اللهم انی اعوذ برب ضاک من سخطک۔"

اور یہ دعا بھی "اللهم یا ذا المن ولا یمن علیہ۔"

احادیث مجھ میں اس موقع کے لیے تو ان دعاؤں کا ذکر کہیں نہیں ملتا البتہ اول الذکر دعا وتر کے آخر میں پڑھنے کی روایت موجود ہے (ابوداؤد، کتاب الصلوۃ)۔ اتباع سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تقاضہ یہ ہے کہ آپ نے جو عمل جس موقع محل کے لیے مخصوص کیا ہے اس میں ذرا بھی رد و بدل نہ کیا جائے اور یہ بھی یاد رہے کہ اتباع سنت رسول ہی حب رسول کی بنیاد ہے۔

عجب ستم ظریفی ہے کہ الیاس قادری صاحب نے اپنے کتابچے میں صوفیوں کی کتابوں، نزہۃ المجالس، غنیۃ الطالبین، انیس الواصلین وغیرہ کے حوالے سے بھونٹی باتوں کا طومار باندھ دیا ہے۔ موصوف نے پندرہویں شعبان کے روزے کی فضیلت یہ بتائی ہے کہ دوزخ کی آگ نہ پھوئے گی۔ درج بالا احادیث میں تو اتنا ہی ملتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم شعبان کے مینے میں کثرت سے روزے رکھتے تھے۔ دوسری روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ہر ماہ ایام بیض (تیرہ، چودہ، پندرہ) کے روزے رکھنے کی ترغیب دی ہے، لیکن کسی بھی حدیث سے پندرہویں شعبان کے روزے کی تخصیص نہیں ملتی اگر یہ نبی علیہ السلام کی سنت ہوتا تو صحابہ، ذوق و شوق سے روزہ رکھتے

اور بکثرت روایات میں اس کا ذکر ہوتا۔ ثابت ہوا کہ اس مخصوص دن کا روزہ یقیناً "بعد کی ایجاد ہے اور یہ خالص بدعت ہے۔

مزید ملاحظہ ہو، مصوفی ہیلانی اور الیاس قادری دونوں صاحبان نے اپنی تحریروں میں اس دن مغرب کے بعد چھ نفل پڑھنا روایت کیا ہے اور ہر دو رکعت کے بعد ایک مرتبہ سورہ یحییٰ اور اکیس مرتبہ سورہ اخلاص پڑھنے کی تلقین کی ہے اور اس کی غرض و غایت یہ بیان کی ہے کہ پہلی دو رکعت درازی عمر کے لیے پڑھی جائیں، دوسری دو کشادگی رزق کے لیے اور آخری دو دفع بلیات کے لیے اور اس معمول کو قادری صاحب نے اولیاء اللہ کی سنت قرار دیا ہے۔ قرآن کی نظر میں تو اولیاء اللہ صرف اور صرف وہ ہیں جو "الذین امنوا و کانوا یتقون" یعنی جو ایمان و تقویٰ کی جوہری صفات کے حامل ہوں (سورہ یونس: ۳۳)۔ اس کسوٹی پر پورے اترنے والوں میں بلاشبہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اعلیٰ ترین مراتب و درجات کے حامل ہیں لیکن ان میں سے کسی ایک کا بھی اس طرح کا عمل صحیح احادیث سے ثابت نہیں۔ دراصل یہ ان صوفیاء کا ہی ایجاد کردہ طریقہ ہے جن کو قرآن و صحیح احادیث سے دور کا بھی تعلق نہیں بلکہ ان کا تمام تر موقف و مسلک قرآن و حدیث سے متصادم ہے اور یہ ہمیشہ کفر و بدعت ہی کی علمبردار رہے ہیں۔

کتابچے کے آخر میں قادری صاحب فرماتے ہیں:-

"الحمد للہ سگ مدت مہفی عنہ کا سالہا سال سے شب براءت میں چھ نوافل ادا کرنے کا معمول ہے"

یہ بات درج بالا سطور میں واضح کر دی گئی ہے کہ اس رات میں خصوصی طور پر چھ نوافل پڑھنا صحیح حدیث سے ثابت نہیں، نیز اوامین کے نام سے روزانہ مغرب کے بعد پڑھے جانے والے چھ نوافل والی روایت کی بھی کوئی حیثیت نہیں، کیونکہ ترمذی نے کتاب الصلوٰۃ میں اس روایت کو لا کر روایت کے آخر میں یہ بتا دیا کہ اس کے ایک راوی عمر بن ابی شحیم کو بخاری منکر الحدیث اور بہت ضعیف قرار دیتے ہیں ضعیف اور منکر روایات کو عقیدہ و اعمال کی بنیاد بنانا ناانجمنندی نہیں۔ یہاں ضمناً یہ عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو اپنے لئے برے القاب نہیں اختیار کرنے چاہئیں، ایسا کرنے سے رب ذو الجلال نے منع فرمایا ہے:-

"ولا تتباضوا باللقاب۔۔۔" (المحرات: ۱۱) (برے لقب نہ دیا کرو۔۔۔)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برے اور ناپسندیدہ نام کو اپنے نام سے بدل دیتے تھے۔ اشرف المخلوقات انسان کا اپنے آپ کو سگ یا کلب (کتا) کہنا نہ صرف ناجائز و حرام بلکہ انتہائی درجہ کافعل قبیح و شنیع ہے خواہ یہ انتہائی محبت و عقیدت کے جذبہ سے ہی کیوں نہ کیا جائے۔ محبت و عقیدت میں غلو ہی انسان کو کفر و شرک کے گڑھے میں گراتا ہے، العیاذ باللہ! کتا تو کتا ہی ہے خواہ وہ مکہ کا ہو یا مدینہ کا۔ نبی علیہ السلام کا فرمان یاد رہے، آپؐ نے فرمایا:

"جس گھر میں کتابا تصویریں ہوں اس گھر میں فرشتے نہیں آتے" (بخاری و مسلم)

صحیح مسلم کی ایک روایت ان عقیدت مندوں کے لیے تازیانہ عبرت ہے، ملاحظہ ہونے۔

"ابن عباسؓ رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ ایک روز صبح کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش و غمگین تھے پھر آپؐ نے فرمایا "آج کی رات مجھ سے جبرئیلؑ نے ملاقات کا وعدہ کیا تھا لیکن مجھ سے ملاقات نہیں کی۔ اللہ کی قسم! جبرئیلؑ نے کبھی مجھ سے وعدہ خلائی نہیں کی۔" پھر آپؐ کے دل میں کہتے کے اس بچہ کا خیال آیا جو آپؐ کے خیمہ کے نیچے پڑا تھا، آپؐ نے اس کو باہر نکال دینے کا حکم دیا چنانچہ اس کو نکال دیا گیا۔ پھر آپؐ نے پانی لیا اور جہاں وہ بچہ بیٹھا تھا اس جگہ پر چھڑکا۔ پھر جب شام ہوئی تو جبرئیلؑ نے آپؐ سے ملاقات کی، آپؐ نے ان سے فرمایا کہ "کل رات آپؐ نے مجھ سے ملاقات کا وعدہ فرمایا تھا۔ جبرئیلؑ نے کہا کہ ہاں، لیکن ہم اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتابا تصاویر ہوں۔" دوسرے روز صبح کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتوں کو مار ڈالنے کا

حکم دیا حتی کہ چھوٹے باغوں کے کتوں کو بھی مار ڈالنے کا حکم دیا اور بڑے باغوں کے کتوں کو چھوڑ دیا۔ (مسلم)

کیسی ستم خیزی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس مخلوق کو مروا ڈالا اور مدینہ کی بستی کو اس کی نجات سے پاک صاف کر دیا، یہ اسی کے نام کو اپنا کر فخر محسوس کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر اللہ اور اس کے رسول کی نظر میں جو مخلوق اس قدر نجس و پلید ہے، کیا وہ ان کی نظر میں اتنی قابل احترام ہے کہ کوئی تو اپنا نام کلب علی رکھتا ہے اور کوئی سگ مدینہ؟ یہ اللہ اور اس کے رسول اور ولیوں سے حب و عشق کی علامت نہیں بلکہ ان سے صریح بغض و عناد ہے، العیاذ باللہ! اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسان کو احسن تقویم پر خلق فرما کر اشرف المخلوقات بنایا، یہ بلاشبہ رب ذوالجلال کا عظیم احسان ہے، لیکن اس ناقدرے اور ناشکرے انسان نے اپنے آپ کو کتا بنا کر "اسفل السافلین" قرار دے دیا۔ اپنے عظیم و کریم رب کی نعمت کا کیسا کفران کیا ہے اس ناشکرے انسان نے، حیف صد حیف۔

تھانوی و قادری صاحبان نے اپنے مضامین میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس رات میں وہ سارے واقعات لکھ دیئے جاتے ہیں جو آئندہ سال ظہور پذیر ہونے والے ہیں۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے اپنے اکابرین کے غلط موقف و عقیدے کی تائید کی ہے جس کی بناء پر عوام میں مشہور کر دیا گیا ہے کہ اس رات اللہ تعالیٰ آئندہ سال کا بیج بتاتا ہے، اور اس سال ہر ایک کی پیدائش و موت اور اس رات سے آئندہ رات تک کے جملہ احوال و معاملات طے کئے جاتے ہیں۔ اس کے ثبوت کے لیے سورہ دخان کی ابتدائی آیات پیش کی ہیں۔

انما نزلناه فی لیلة مبارکہ..... الخ

ترجمہ: "ہم نے اسے ایک مبارک رات میں نازل کیا ہے۔ بیشک ہم اپنے بندوں کو (ان کی غلطیوں پر) ڈرانے والے ہیں اس میں تمام حکمت کے کام کے فیصلے کئے جاتے ہیں۔"

ان کے باطل نظریے کا قرآن و حدیث کی روشنی میں جائزہ لینے سے قبل یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ خالق کائنات نے اس کی تخلیق سے ہزاروں سال قبل وہ تمام امور طے کر دیئے جو آئندہ ظہور پذیر ہونے والے ہیں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ لا تبدل لکلمات اللہ (اللہ کی باتیں بدلا نہیں کرتیں)۔ ہاں اگر اس کا یہ مفہوم لیا جائے کہ ایک سال کے احکام و معاملات لوح محفوظ سے لے کر فرشتوں کے حوالے کر دیئے جاتے ہیں، تو پھر یہ بات وضاحت طلب ہوگی کہ وہ کون سی رات ہے؟ سورہ دخان میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے اس (قرآن) کو ایک مبارک رات میں نازل فرمایا ہے اس میں ہر حکمت والا کام بانٹ دیا جاتا ہے (یا فیصلہ کر دیا جاتا ہے)۔ (الدخان: ۴۳) اور یہ تمہارے رب کی طرف سے رحمت ہے (الدخان: ۴۴)۔ مکہ ہی میں نازل ہونے والی سورۃ القدر میں بھی اس رات کی یہی خصوصیات بتا کر اس کو "لیلۃ القدر" کا نام دیا۔ اس سورۃ میں فرمایا "ہم نے اس (قرآن) کو لیلۃ القدر میں نازل کیا" ہے۔ آگے جا کر بتایا کہ "اس میں حکمت اور روح الامین کا تمام امور (کے فیصلوں) کے ساتھ نزول ہوتا ہے اور طلوع فجر تک یہ رحمت و سلامتی کی رات ہے۔ قرآن کی ان سورتوں نے یہ تو ثابت کر دیا کہ "لیلۃ القدر" اور "لیلۃ مبارکہ" دراصل ایک ہی رات ہے جس میں قرآن کا نزول ہوا لیکن مبینہ حدیث کا ان آیات میں تعین نہیں کیا گیا۔ ہجرت کے تقریباً "دو سال بعد جب میام رمضان فرض کئے گئے تو سورۃ البقرہ کی آیت صوم میں اس کی بھی وضاحت ہو گئی۔ چنانچہ فرمایا:

شہر رمضان الذی انزل فیہ القرآن..... (البقرہ: ۱۸۵)

ترجمہ: ماہ رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔

اس طرح قرآن ہی میں یہ اہم وضاحت فرما کر اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی قیاس آرائی کا راستہ بند کر دیا۔ ثابت ہو گیا کہ نزول قرآن والی مقدس و بابرکت رات (لیلۃ القدر یا لیلۃ المبارکہ) رمضان المبارک میں ہوتی ہے۔ پھر صحیح احادیث میں نبی علیہ السلام نے رہنمائی فرمادی کہ اس مقدس و بابرکت رات کو رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔ اس طرح بات صاف ہو گئی۔

اب قرآن کی محکم و صریح آیات اور احادیث صحیحہ کے مقابلے میں بلا سند روایات کے سارے شعبان کی پندرہویں رات کو "لیلۃ المبارکہ" قرار دے کر شبِ براءت کے لیے بنیاد فراہم کرنا اور اس میں کی جانے والی بدعات و خرافات کے لیے راہِ ہموار کرنا سخت بہالت اور ہٹ و حمزہ ہے اور آیات قرآنی کا انکار!

اس رات کے اشغال میں باجماعت صلوٰۃ التَّسْبِیْح پڑھنے کا خصوصی اہتمام بھی شامل ہے۔ خیر القرون (صحابہؓ) تابعین اور تبع تابعین کے ادوار میں جماعت کے ساتھ صلوٰۃ التَّسْبِیْح ادا کرنے کی تو کوئی روایت نہیں ملتی بلکہ انفرادی طور سے بھی یہ عمل مشکوک حیثیت رکھتا ہے۔ سنن اربع کی روایت میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا عباس رضی اللہ عنہ کو روزانہ ایک مرتبہ یہ صلوٰۃ ادا کرنے کی تلقین فرمائی اور کہا کہ اگر روزانہ نہ پڑھ سکیں تو ہر جمعہ کو ادا کریں یہ بھی نہ کر سکیں تو ہر مہینہ میں ایک مرتبہ یا سال میں ایک مرتبہ ورنہ کم از کم عمر بھر میں ایک بار ہی ادا کر لیں۔ اس کی فضیلت یہ بتائی کہ اس سے اگلے پچھلے سترے پڑے اے، عہدِ "صوا" "جھوٹے پڑے" پوشیدہ نکال دیتے ہیں۔ سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں خواہ وہ ریت کے ذرات کے برابر ہی کیوں نہ ہوں۔

صلوٰۃ التَّسْبِیْح کی روایت سند کے لحاظ سے بے حد مشکوک حیثیت رکھتی ہے اور آئمہ حدیث کو اس کی سند میں سخت تر کلام ہے۔ ابن خزیمرہ کہتے ہیں "ان صبح الحبر فان فی القلب من هذا لا سبباً شئياً" یعنی اگر یہ صحیح بھی ہو جائے تو بھی اس کی سند کے بارے میں دل میں غلجان باقی رہ جاتا ہے۔ ابن جوزی اس کو موضوعات میں شمار کرتے ہیں۔ ترمذی نے اس کو ابو رافع کی سند سے غریب کہا ہے اور آگے چل کر بتایا ہے کہ صلوٰۃ التَّسْبِیْح سے متعلق کئی روایات ہیں جن میں سے اکثر صحیح نہیں۔ اس کے تین طرق میں دو بالکل ضعیف ہیں اور ایک ابن عباسؓ والا طرق صحیح ہے لیکن اس میں بھی موسیٰ بن عبد العزیز بعض کے نزدیک مجہول ہے۔ یہ تو رہا سند کا معاملہ۔ اب ذرا متن پر نگاہ ڈالیں تو یہ روایت ایک عجوبہ ہی معلوم ہوتی ہے کہ ہر روز سے لے کر عمر میں صرف ایک مرتبہ کر لینے تک کی پھوٹ اور عمر میں صرف ایک مرتبہ صلوٰۃ التَّسْبِیْح ادا کر لینے سے اگلے پچھلے عمر بھر کے سارے ہی گناہ معاف ہو جائیں خواہ کبیرہ ہوں یا صغیرہ عہدِ "ہوں یا صوا" وغیرہ۔ پھر تو صلوٰۃ خمسہ کی بھی اس کی آگے کوئی حیثیت نہ رہی اور اس کا ایک یہ نقل ہے اور وہ صلوٰۃ مکتوبہ یعنی فرض نماز ہے اور کسی حالت میں بھی معاف نہیں (سوائے عورت کو ایام کی حالت میں) یہ بات بھی کچھ عجیب معلوم ہوتی ہے کہ عمر بھر میں ایک دفعہ کرنے سے اتنا بڑا اجر مل جائے تو روزانہ مشکل میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے!۔ الغرض درایت کے اصول پر تو یہ اور بھی زیادہ بے حیثیت ثابت ہوتی ہے۔ اس رات میں ایک ریت یہ بھی پڑ گئی ہے کہ بعض مساجد میں پہلے صوفیوں کے انداز میں سب مل کر "ہو" "ہا" کی ضربیں لگاتے ہیں پھر روشنی بند کر کے اجتماعی طور سے انصرع کے ساتھ دعائیں مانگتے ہیں۔ قرونِ اولیٰ میں اس طرزِ عمل کا قطعی فقدان ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس ریاکارانہ مخصوص انداز اختیار کرنے کی اجازت تو خیر کیا دیتے وہاں تو ہمیں ہاتھ اٹھا کر اجتماعی دعا کی بھی کوئی مثال نہیں ملتی سوائے بارش کی دعا (صلوٰۃ استسقاء میں)۔ بخاری کی کتاب الاستسقاء کی انسؓ کی روایت تو حدیث کا مطالعہ کرنے والوں کی نظر سے یقیناً گزری ہوگی۔ دس سال تک نبی علیہ السلام کے شب و روز کے معمولات کا مشاہدہ کرنے والے آپؐ کے خادم خاص انسؓ بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم دعا کے لیے ہاتھ نہیں اٹھایا کرتے تھے مگر استسقاء میں اور اس میں اتنے اٹھاتے کہ آپؐ کی بقلوں کی سفیدی نظر آنے لگتی۔ اس روایت کے بعد تو (بارش کے علاوہ) اجتماعی ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کا قطعاً "کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ اور صلوٰۃ میں سلام پھیرنے کے بعد انفرادی دعائیں ہاتھ اٹھانے کی بھی کوئی صحیح روایت نہیں ملتی۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اس رات ایک فرقہ سے منسلک لوگ اپنی مساجد میں چڑھا کر کہتے ہیں "یہ امر قابلِ مذمت ہے کہ اکثر مقامات پر بجلی کے تاروں میں تار لگا کر براہِ راست بجلی حاصل کی جاتی ہے اور شاید اس حرام و ناجائز کام کو کارِ ثواب خیال کیا جاتا ہے" افسوس صد افسوس! گھروں میں چراغ و موم بتیاں جلاتے ہیں۔ انواع و اقسام کے کھانے، حلوے وغیرہ پکائے اور تقسیم کئے جاتے ہیں "مسور کی دال کے ساتھ سلاوا اور سرکہ کا بھی اہتمام ہوتا ہے اور یہ تمام کام سنت

سمجھ کر رہی گئے جاتے ہیں جبکہ فی الحقیقت ان چیزوں کا سنت رسولؐ اور صحابہؓ کرام سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ حلوہ پکانے کی یہ توجیہ کی جاتی ہے کہ اس روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دندان مبارک شہید ہوئے تھے اور انہوں نے حلوہ کھایا تھا۔ تاریخ اسلام سے معمولی سی واقفیت رکھنے والا بھی اس کے سراسر باطل اور بے بنیاد ہونے کو جان سکتا ہے۔ کیا غزوہ احد جس میں نبی علیہ السلام کے دانت نئے شعبان میں وقوع پذیر ہوا تھا! تاریخ وقوع سے ڈیڑھ ماہ قبل حلوہ پکانے کی کیا تک ہے؟۔ بعض لوگ اس حلوے پر اویس قرنی کی نیاز دلاتے ہیں۔ قرآن و حدیث کی رو سے غیر اللہ کے نام کی نذر و نیاز مشرکانہ فعل ہے اور یہ کھانا حرام ہے۔ بعض صاحبان نیاز تو نہیں دلاتے مگر حلوہ ضرور پکاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دوسروں کے گھر سے آتا ہے تو انھیں دینا بھی پڑھتا ہے، بچے بھی مانگتے ہیں اور خود بھی دل چاہتا ہے۔ یہ تو سراسر منافقانہ انداز ہے۔ اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کے نام کی نذر و نیاز کرنا ہی حرام نہیں، اس کا لینا اور کھانا بھی حرام ہے۔ مشرکانہ فعل سے مشابہت کو بھی ممنوع قرار دیا گیا چنانچہ فرمان نبویؐ ہے: ”مَنْ تَشَبَهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ“ (جو کسی قوم کی نقل کرے گا تو وہ انہی کے ساتھ ہوگا) ہمیں اپنی خواہشات اور بچوں کو اللہ کے حکم کے تابع کرنا چاہیے، دین کا یہی تقاضہ ہے۔ کھانے پینے کی چیزیں دوسرے دنوں میں پکا کر شوق پورا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

اویس قرنی کے نام کی نیاز دینے والے یہ کہانی بھی بیان کرتے ہیں کہ ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنی محبت تھی کہ نبی علیہ السلام کے دانت نوٹنے کی خبر سن کر انہوں نے اپنے تمام دانت توڑ ڈالے کہ نہ جانے نبیؐ کا کون سا دانت شہید ہوا ہوا۔ حیرت ہے کہ یہ عشق و محبت کی داستانیں گھڑنے والے عقل سلیم سے ذرا بھی کام نہیں لیتے۔ ذرا تو سوچئے کہ اپنے دانتے بنائے صحیح سالم دانت توڑ ڈالنا نہ صرف اپنی جان پر سراسر ظلم ہے بلکہ یہ تو خود کشی کے مترادف ہے اور اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت کا صریح کفران۔ نبی علیہ السلام کے بڑے بڑے ہاں دار صحابہ کرامؓ موجود تھے ان میں سے کسی نے آنکھوں سے دیکھنے کے بعد بھی اپنا ایک دانت بھی نہ توڑا۔ سگ مدینہ کے لقب کو اختیار کرنے والے قادری صاحب نے اپنے کتابچے میں بریلوی فرقے کے بانی امام احمد رضا خاں صاحب کا ایک خط بھی چھپایا ہے جس میں خاں صاحب مکتوب الیہ کو لکھتے ہیں کہ وہ شب براءت کے معمولات کو اپنے یساں بھی رواج دیں کیونکہ ”مَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهُ أَجْرٌ مِثْلُ مَنْ عَمِلَ بِهَا أَلَيْسَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لَا يَنْقُصُ مِنْ أَجْوَرِهِمْ شَيْئًا“ یعنی ”جو اسلام میں اچھی راہ نکالے اس کے لیے اس کا ثواب ہے اور جو قیامت تک اس پر عمل کریں ان سب کا ثواب بیش اس کے نامہ اعمال میں لکھا جائے بغیر اس کے کہ ان کے ثواب میں کچھ کمی آئے۔“ غور فرمائیے، کس شان سے صحیح حدیث کو غلط معنی کے لباس سے آراستہ کر کے اس کے بجاوے محل استعمال سے حق کو باطل اور باطل کو حق ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سنت نبویؐ سے ہٹ کر کوئی راہ اسلام میں اچھی راہ کیسے ہو سکتی ہے؟ ایسی ہر نئی راہ بدعت ہوگی اور ہر بدعت گمراہی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمت کا اتمام کر دیا (المائدہ: ۳) اور خیر و شر کے سارے کام اپنے نبیؐ کے ذریعہ واضح کر دیے اور دین کا کوئی تشکیک یا تذبذب تکمیل پسند دوسروں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا۔ نیکی کمانے، اجر حاصل کرنے کے سارے انداز نبی علیہ السلام نے اپنی امت کو تحقیق فرما دیے۔ اب اگر کوئی نیک بخت ایسی راہ کی طرف رہنمائی کرے جو صحیح احادیث کی روشنی میں نبی علیہ السلام کی سنت کے عین مطابق ہو (اور جس کو لوگ فراموش کر چکے ہوں) تو وہ یقیناً ”سنت حسنہ کملائے گی اور درج بالا روایت کا اطلاق اس پر ہوگا۔ اس کے برعکس اگر کسی نے کوئی نئی بات اختراع کی جس کی تائید سنت نبویؐ (احادیث صحیحہ) سے نہیں ہوتی تو وہ ہرگز سنت حسنہ نہیں ہو سکتی بلکہ وہ بدعت قرار دی جائے گی اور غیر مقبول یا مردود ٹھہرے گی۔ نبی علیہ السلام بدعت کو شر الامور (سب سے بری بات) قرار دیا ہے اور بدعت کی بہت زیادہ مذمت فرمائی ہے، ملاحظہ ہو:

۱۔ فان خیر الحدیث کتاب اللہ وخیر الہدیٰ ہدیٰ محمد وشر الامور محدثاتہا
وکل بدعة ضلالة۔ (مسلم)

ترجمہ : "سب سے بہتر کلام اللہ کی کتاب ہے اور بہترین طریقہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے اور بلاشبہ بدعت سب سے برا کام ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔"

۲..... من أحدث فی امرنا هذا ما لیس منہ فہو رد..... (مقل علیہ)

ترجمہ : "جس نے ہمارے دین میں کوئی نئی بات نکالی جو اس میں نہ تھی تو وہ مردود ہے۔"

۳..... من عمل عملاً لیس علیہ امرنا فہو رد..... (مسلم)

ترجمہ : "جس نے کوئی عمل کیا جس پر ہمارا حکم نہیں تو وہ مردود ہے۔"

مندرجہ بالا صحیح مسلم کی روایت میں نبی علیہ السلام نے ہر بدعت کو گمراہی کہا ہے اور سنن نسائی کی کتاب صلوٰۃ العیدین میں "کل ضلالۃ فی النار" کا اضافہ ہے یعنی ہر بدعت یا دین میں نئی چیز نکالنے والا اور اس پر عمل کرنے والا جہنم کی آگ میں ہے۔ ثابت ہوا کہ بدعات کے ارتکاب پر ثواب نہیں بلکہ آگ کا عذاب ہوگا۔ اللہ پناہ میں رکھے! ترمذی کی مذکورہ بالا روایت جس کو خاں صاحب نے غلط معنی دے کر بدعت کی تائید میں استعمال کیا ہے اس سے قبل اور بعد متعدد روایات ہیں جو اس بات کو مزید واضح کرتی ہیں (ملاحظہ ہو ترمذی ابواب العلم)

۱..... من دعا الی ہئی کان لہ من الاجر مثل اجور من یتبعہ لا ینقص ذالک من اجور ہم شیا..... الخ

ترجمہ : "جس نے کسی کو بدعت کی طرف بلایا تو اس کو پیروی کرنے والوں کے برابر اجر ملے گا اور پیروی کرنے والوں کے اجر میں کوئی کمی نہ ہوگی اور گمراہی کی طرف دعوت دے گا تو اس کو اس پر عمل کرنے والوں کے برابر گناہ ہوگا اور ان کے گناہوں میں کوئی کمی نہ ہوگی۔"

۲..... من سن سنة خیر فاتبع علیہا فله اجر ہو مثل اجور من اتبعہ غیر منقوص من اجور ہم..... الخ

ترجمہ : "جس نے کوئی اچھا طریقہ رائج کیا اور اس پر عمل کیا گیا تو اس کے لیے اس کا اجر ہے اور اس کی پیروی کرنے والوں کے برابر اجر" اور ان کے اجر میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ اور جس نے کوئی برا طریقہ رائج کیا اور اس کی پیروی کی گئی تو اس پر اس کا گناہ ہوگا اور ان سب کا بار گناہ بھی جو اس پر عمل کریں اور ان کے گناہوں میں کوئی کمی نہ ہوگی۔"

یہ بات بھی یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بھی اس اہم مسئلہ کو واضح فرما دیا ہے۔

..... ول یحملن اثقالہم واثقالاً مع اثقالہم..... الخ (العنکبوت: ۱۳)

ترجمہ : "وہ ضرور اپنا بوجھ اٹھائیں گے اور اپنے بوجھوں کے ساتھ ان (دوسروں) کا بوجھ بھی....."

یہ اصول واضح کر دیا گیا کہ معاشرہ میں برائی (کفر و شرک و بدعات اور ظلم و جور وغیرہ) پھیلانے والے اپنے گناہوں کے بوجھ کے ساتھ ان کی پیروی ان برائیوں کا ارتکاب کرنے والے عوام کے گناہوں کا بار بھی اٹھائیں گے۔ مثلاً "قاتل جو قتل ناحق کا سب سے پہلا مرتکب ہے تو قیامت تک جتنے قتل ناحق ہوں گے تمام قاتلوں کو ان کے گناہ کی جو سزا ملے گی قاتل پر ان سب کے گناہوں کا بوجھ ہوگا۔" (فقاری)۔

۳..... من دل علی خیر فله مثل اجر فاعلم لوقال عاملم.....

ترجمہ : ”خیر کی طرف رہنمائی کرنے والے کو اتنا ہی اجر ملے گا جتنا اس کے کرنے والے کو۔“
 ۴..... وایاکم ومحدثات الامور فانها ضلالة فمن ادرك ذلکم منکم... الخ
 ترجمہ : ”پس نئی باتوں (بدعتوں) سے بچتے رہنا کیونکہ وہ گمراہیاں ہیں۔ تو جو تم میں سے اسے پائے اسے لازم ہے کہ میری اور ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی سنت کی پیروی کرے اور اسے دانتوں سے قہام لے۔“
 ۵..... من احبلی سنة من سنتی قد امیتت بعدی کان له من الاجر مثل من عمل بها من غیر ان ینقص من اجورهم شیئا... الخ
 ترجمہ : ”جس نے میری کسی سنت کو زندہ کیا (راج کیا) جو میرے بعد مر گئی تھی تو اس کو اتنا اجر ملے گا جتنا اس کے کرنے والوں کو ملے گا اور ان کے اجر میں کچھ کمی نہ کی جائے گی۔ اور جو کوئی گمراہی والی بدعت نکالے جس سے اللہ اور اس کے رسول راضی نہ ہوں تو اس پر اتنا گناہ ہوگا جتنا اس پر عمل کرنے والوں کو ہوگا اور ان کے بارگناہ میں کوئی کمی نہ ہوگی۔“

شب قدر

ان تمام راتوں میں یہی اکیلی رات ہے جس کی فضیلت قرآن و حدیث سے ثابت ہے اور اس میں پوری رات جاگنے کی ترغیب و تاکید فرمائی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس عنوان سے پوری سورہ نازل فرمائی ہے یعنی سورۃ القدر جس میں لیلۃ القدر کی اہمیت و فضیلت کو امتیازی شان سے اجاگر فرمایا ہے۔

انا انزلنہ فی لیلۃ القدر... الخ
 ترجمہ : ”ہم نے اس (قرآن) کو نازل فرمایا ہے لیلۃ القدر میں اور تمہیں کیا معلوم لیلۃ القدر کیا ہے۔ لیلۃ القدر تو ہزار مہینوں سے بہتر ہے جس میں فرشتے اور روح (جبرئیل) اپنے رب کی اجازت سے ہر حکم لے کر اترتے ہیں اور صبح تک سلامتی رہتی ہے۔“

جیسا کہ اوپر ثابت کیا گیا اسی رات کو سورہ دخان میں ”لیلۃ مبارکۃ“ کہا گیا ہے اور وہاں بھی اسی انداز سے اس کی فضیلت کا ذکر ہے۔ بخاری و مسلم کی روایت میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ

من قام لیلۃ القدر ایمانا واحتسابا غفر له ما تقدم من ذنبه

ترجمہ : ”جس نے بھی ایمان و احتساب کے ساتھ لیلۃ القدر میں قیام کیا اس کے پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔“

رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس رات میں عبادت کے لیے انتہائی خصوصی اہتمام فرمایا کرتے تھے۔ اگرچہ اس رات کی تعیین میں مختلف اقوال ہیں اور پچیس و ستائیس شب کی روایات بھی ہیں لیکن حتمی طور سے نبی علیہ السلام نے رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں شب قدر کو تلاش کرنے کی تاکید فرمائی ہے یعنی رمضان کی ۲۱، ۲۳، ۲۵، ۲۷ اور ۲۹ شب کو خصوصی شب بیداری اور عبادت کا حکم دیا ہے۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال آخری عشرے میں اعتکاف فرماتے تھے۔ ان راتوں میں آپ پوری پوری رات جاگتے اور گھر والوں پر بھی زور دیتے۔ یہ راتیں عبادت و ریاضت، ذکر اور دعاؤں کے لیے مخصوص ہیں۔ قیام اللیل (نوافل کی ادائیگی) تو سب سے افضل عبادت ہے اس کے علاوہ قرآن و حدیث کا مطالعہ غور و فکر کے ساتھ کیا جائے، ذکر اور دعاؤں کی جائیں۔ اللہ کی توحید، کبریائی، حمد و تسبیح پر مشتمل اذکار جو صحیح احادیث میں ملتے ہیں انہی پر اکتفاء کرنا چاہیے اور توبہ استغفار بھی زیادہ سے زیادہ ہونا چاہیے۔ البتہ نبی علیہ السلام نے ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کو لیلۃ القدر کے لیے مخصوص دعا سکھائی:

اللهم انك عفو تحب العفو فاعف عني

ترجمہ : "اے اللہ تو (سراسر) معافی ہے، معافی کو پسند فرماتا ہے، میں تجھے معاف فرما دے۔"

الغرض "لیلۃ القدر" کو رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں تلاش کرنے اور اس میں عبادت کرنے کی بخاری و مسلم اور دیگر کتب حدیث کی بے شمار روایات ہیں اور اس رات کی اہمیت و فضیلت ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے، کسی اور رات کو اس کے مقابلہ میں لانا محض گمراہی و جہالت ہے۔

شب جمعہ

ان مخصوص راتوں کے علاوہ ایک اور رات بھی ہے جس کی بہت زیادہ فضیلت بیان کی جاتی ہے، یہ ہے جمعرات و جمعہ کی درمیانی شب۔ صوفیاء کے یہاں اس کی بہت اہمیت ہے اور ان میں سے بھی قمری سینہ کی پہلی شب جمعہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس رات میں عبادت و ریاضت کا نہ صرف صوفیاء بلکہ "تقریباً" تمام ہی فرقوں میں خصوصی اہتمام ہوتا ہے، ان میں بریلوی، دیوبندی، بالخصوص تبلیغی جماعت (والے) شامل ہیں۔ اب دیکھتے ہیں رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کا اس رات کے بارے میں کیا موقف ہے۔

عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تختصو لیلۃ الجمعة بقیام من بین الیالی فلا تختصو یوم الجمعة بصیام من بین الایام الا ان یکون فی صوم یصومہ احدکم۔۔۔ (مسلم بحوالہ مشکوٰۃ)

ترجمہ : "ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہ مخصوص کرو جمعہ کی رات کو عبادت کے لیے اور نہ جمعہ کے دن کو صوم کے لیے مگر یہ کہ تمہارے روزے کے دن جمعہ چڑ جائے۔"

جیسا کہ ماقبل عرض کیا گیا اتباع سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بنیادی تقاضہ تو یہ ہے کہ جس رات یا دن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادت کے لیے مخصوص کیا ہے اسی کو مخصوص سمجھ کر اس موقع پر اتنا ہی عمل کیا جائے جو حدیث سے ثابت ہو اور جس دن یا رات کو نبی علیہ السلام نے مخصوص نہیں کیا ہے اس کو مخصوص کرنے کو بدعت قرار دیا جائے ("کل محدث بدعة" کے مطابق)۔ حیرت ہے کہ اسلام کو بذریعہ تبلیغی و فوہ اقتضائے عالم میں پھیلانے کے مدعی دیوبندی و بریلوی وغیرہ نبی علیہ السلام کے فرمان کی اعلانیہ خلاف ورزی کے مرتکب ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صریحاً "جس رات کو عبادت کے لیے مخصوص کرنے سے منع فرمایا ہے" یہ اس رات کو نہ صرف یہ کہ عبادت کے لیے مخصوص کرتے ہیں بلکہ شب قدر کی طرح اس میں اپنے مراکز میں قیام وغیرہ کا اہتمام کرتے ہیں، رب ذوالجلال کے اس حکم کی خلاف ورزی کر کے اس کے قہر و غضب کو دعوت دے رہے ہیں۔

وما اثمکم الرسول فخذنہ وما نہکم عنہ فانہو۔۔۔ (المائدہ)

(جو کچھ رسول تمہیں دیں اس کو لو اور جس سے روکیں اس سے باز رہو)۔

اور اس کے عذاب کی وعید سے کیسے غافل ہیں؟

وانقوا للہ العن اللہ شدید العقاب۔۔۔ (المائدہ) (اللہ سے ڈرتے رہو، بلاشبہ وہ سخت عذاب دینے والا ہے)

حتم ظہری تو یہ ہے کہ سنت کا اس طرح تسخیر اڑانے والے اپنے آپ کو اہل سنت کہتے ہیں اور حب رسول کا دم بھرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ حق جاننے، ماننے اور اس پر پوری طرح عمل کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے تا آنکہ:

لیہلک من ہلک عن بینۃ و یحیی من حیۃ عن بینۃ

نسل اللہ العافیہ و الہدایہ لنا ولہم ولکل امۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

آمین یا رب العالمین

وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ

يَعْقُوبُ عَلِي

آج سے تقریباً "چودہ سو سال قبل اللہ تعالیٰ نے اپنے پسندیدہ دین 'دین اسلام کو پایہ تکمیل تک پہنچا کر اس ابدی نعمت کا اتمام فرمادیا تھا۔ اس دین کی اساس اور سرچشمہ ہدایت 'قرآن حکیم کی حفاظت کی ذمہ داری خود ہی لے لی اور اس کی تفسیر و تشریح کو احادیث صحیحہ کی شکل میں مرتب کرا کے محفوظ فرمادیا۔ اس طرح صراطِ مستقیم پر چل کر منزل مقصود تک پہنچنے کی تڑپ رکھنے والوں کے لیے دین و ایمان کی حفاظت کا جامع و ٹھوس اہتمام فرمادیا اور ساتھ ہی پیش بندی کے طور پر ان کو ہوشیار بھی کر دیا تھا:

○ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِنَ الْأَحْبَابِ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ (النور: ۲۴)

"اے ایمان والو! ان مولویوں اور پیروں کی اکثریت لوگوں کا مال باطل طریقے سے کھاتی ہے اور انہیں اللہ کی راہ سے بھی روکتی ہے"

○ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ (لوحین: ۲۲) (الروم: ۲۲)

"اور ان مشرکوں کی روش اختیار نہ کرو جنہوں نے دین میں تفرقہ پر دازی کی، گروہ بندی کا شکار ہو گئے اور ہر گروہ اسی پر مگن ہے جو اس کے پاس ہے"

لیکن شیطان کا وار پہلے انہی پر کار گر ہوا اور بھیلی امتوں کے احبار و رہبان کی طرح یہ شیطان لعین کے آلہ کار بن گئے، اپنی دنیا بنانے کے لیے اللہ کے بندوں کو گروہوں میں تقسیم کرنے میں لگ گئے، 'قرآن و صحیح احادیث پر کتمان کے دبیز غلاف چڑھا کر لوگوں کو سرچشمہ ہدایت سے دور کر دیا۔ پھر موضوع، منکر و ضعیف روایات اور اپنے بزرگوں کے اقوال کی بنیاد پر ایسا کردہ نظریات پر ایمان و عقیدہ کو استوار کیا گیا اور قرآن و حدیث کی معنوی تحریف اور من مانی تاویل کے ذریعہ باطل پرستی کی عمارت کو تقویت پہنچانے کی سعی و جہد کو مقصد حیات بنا لیا گیا۔

۴۔ عذاب قبر حق ہے: جس طرح بھیلی امتوں میں مردوں کو زندہ تصور کر کے سورتیوں اور قبروں کی شکل میں انبیاء و صلحاء کی پوجا پاٹ کا دین ایجاد کر کے دین حق پر مسلط کیا گیا تھا، آج ہمارے سامنے بھی وہی صورت حال ہے۔ یعنی قبر پرستی کے دین کا اللہ کے سچے دین پر غلبہ ہے۔ عقیدہ "عود روح" کے ذریعے مردے زندہ مان لیے گئے ہیں، اللہ کے بندوں کو اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام دے کر ان کی قبروں کو شیطانی مشن کے مراکز بنا دیا گیا ہے جہاں وہ سب کچھ ہوتا ہے جو صنم کدوں میں ہوتا رہا ہے۔ تو یہ ہے ما "صل اعادہ روح کے عقیدہ کا" البتہ اب ایک یہ ہوشیاری بھی کی گئی ہے کہ اس باطل نظریہ "عود روح" کو صحیح اور سچے عقیدہ "عذاب قبر" کے ساتھ منسلک کر دیا گیا ہے۔ دراصل

یہ تیسری حق و باطل کی فریب کارانہ کوشش ہے۔ بلاشبہ "عذاب قبر" حق ہے اور جو اس کو نہ مانے وہ قرآن و حدیث کا منکر یقیناً "کافر" ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ عذاب قبر ہوتا کہاں ہے؟ عالم برزخ میں یا اسی زمینی گڑھے میں جسے معروفاً "قبر" کہا جاتا ہے۔ عذاب قبر کا عالم برزخ میں ہوتا تو قرآن و حدیث سے ثابت ہے جس کی وضاحت آئندہ طور میں ہوگی لیکن اس دنیاوی گڑھے میں سوال و جواب اور پھر عذاب و راحت کا دار و مدار تو عقیدہ "حیات فی القبر" یعنی اس مردہ لاشے میں دوبارہ روح لوٹائے جانے کے عقیدہ پر ہے۔ ہونی الحقیقت ان قبر پرستوں کو مقصود و مطلوب ہے کیونکہ اس کے بغیر تو قبر پرستی کی عمارت کے منہدم ہونے کا شدید خطرہ ہے۔ اسی لیے قرآن و حدیث کے واضح و محکم دلائل کے باوجود عالم برزخ میں سوال و جواب اور عذاب و راحت کے موقف کو تسلیم کر لینے کی بجائے تمام سعی و جہد اس کو رد کرنے پر مرکوز ہے اور پورا زور اس باطل موقف کے دفاع میں صرف کیا جا رہا ہے کہ سوال و جواب اور عذاب و راحت کا معاملہ اسی دنیاوی قبر میں ہوتا ہے تاکہ قیامت سے پہلے مردہ جسموں میں اعادہ روح کے ساتھ حیات فی القبر کے لیے راہ ہموار ہو سکے اور اس طرح فوق قبر پرستی کی تسکین ہو۔ لیکن یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ یہ بت پرستی ہی کی ایک شکل ہے کیونکہ ہر حال پوچھا تو ان ہستیوں کو جاتا ہے جن کو مورتیوں یا قبروں میں زندہ تصور کر لیا گیا ہے۔ اب جب ان کو قرآن و صحیح احادیث کے دلائل سے سمجھایا جاتا ہے کہ آپ ان کو پتائیں سنا رہے ہیں اور ان سے التجاؤں پر التجائیں کئے جا رہے ہیں جو نہ سن سکتے ہیں اور نہ کچھ کر سکتے ہیں اور وہ مردہ ہیں زندہ نہیں۔ اور ان قبروں میں جن سے تمساری امیدیں وابستہ ہیں اور جن کے خوف سے تم لرز رہے ہو ان میں تو کئی سڑی ہڈیوں کے سوا کچھ نہیں جو جلد ہی مٹی کے ساتھ مٹی ہو جائیں گی یا ہو چکی ہوں گی تو جواب دیتا ہے کہ آپ کا موقف غلط ہے "مردہ میں روح لوٹ آتی ہے اور وہ سنتا ہے اور زائرین کو پہچانتا ہے" وہ تو نرمادہ کی تمیز بھی کر لیتا ہے " (معاذ اللہ)۔ مقام عبرت ہے "اکابر پرستی اور اندھی عقیدے نے انسان کو کیسا بھٹکایا ہے" زندہ اور مردہ برابر ہی نہیں بلکہ مردہ زندہ سے زیادہ قوی اور با اختیار ہو گیا! (معاذ اللہ!) حق و باطل کا معیار صرف اور صرف بزرگوں کے اقوال ہیں اور پھر ان کی تائید کے لیے موضوع و منکر اور ضعیف روایات۔ اب ان کو بتایا جاتا ہے کہ قرآن کے مطابق تو مردے مردے ہی ہیں زندہ نہیں وہ قیامت کے دن ہی زندہ کئے جائیں گے "اس سے پہلے ان کے زندہ ہونے کا نظریہ صریحاً" خلاف قرآن ہے اور ایسے نظریے کو اپنانا تو قرآن کا کفر ہے" تو فتویٰ داغ دیا جاتا ہے کہ "یہ عذاب قبر کے منکر ہیں!"۔ بطور بالا میں وضاحت کر دی گئی ہے کہ قبر میں عذاب یا راحت کا نظریہ برحق ہے اور اس کا انکار ہی مسلم نہیں ہو سکتا جب تک کہ قہر نہ کرے۔ لیکن یہ عالم برزخ کا معاملہ ہے نہ کہ اس دنیاوی گڑھے کا یہ معاملہ مرنے کے فوراً بعد برزخ میں شروع ہو جاتا ہے اور قیامت تک جاری رہے گا اور یہ ہر ایک کے ساتھ ہوتا ہے خواہ اس کا لاشہ جلا دیا جائے وہ جنگلی جانور یا مچھلیوں کی غذا بن جائے یا کسی میڈیکل کلج کی تجربہ گاہ کی زینت بن جائے تاکہ طلباء مشاہدہ و مطالعہ کرتے رہیں یا مردہ خالے میں برف کی سطحوں میں مینوں دبا پڑا رہے یا اس کے اعضاء (انکلیں وغیرہ) کسی زندہ شخص کے جسم میں لگا دئے جائیں یا لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے قبر سے نکال لیا جائے۔ ہر حال یہ اسباب و عوامل جن کا تعلق تو دنیاوی لاشے سے ہی ہے قبر (یعنی عالم برزخ) میں عذاب و راحت میں رکاوٹ ہرگز نہیں بن سکتے اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ یہ بات ذہن نشین کر لی جائے کہ یہ معاملہ نہ تو ہمارے اختیار میں ہے اور نہ ہماری صوابدید پر موقوف کہ جب چاہیں مردے کو قبر سے نکال کر عذاب و راحت کو روک دیں اور جب چاہیں لاشے کو قبر میں ڈال کر عذاب میں مبتلا کر دیں۔ کیسی ختم عمری ہے کہ یہ فرق پرست قرآن و حدیث کے نفوس اور ناقابل رد دلائل کے باوجود اس موقف کو تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے کہ سوال و جواب اور

سب سے پہلے یہ اور بات ہے کہ بعض دہرا معیار رکھنے والے حیات فی القبر کا انکار بھی کرتے ہیں لیکن سوال و جواب کے لیے روح کا مردہ لاشے سے تعلق ہی ثابت کرتے ہیں۔

عذاب و راحت کا معاملہ عالم برزخ میں ہوتا ہے اس دنیا میں نہیں بلکہ الٹا ہمارے خلاف معاندانہ پروپیگنڈا شروع کر دیتے ہیں کہ یہ لوگ عذاب قبر کو نہیں مانتے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ عذاب قبر کو ہم نہیں مانتے یا یہ فرقہ پرست!۔ یہ اسی دنیاوی گڑھے میں سوال و جواب اور عذاب و راحت پر زور دیتے ہیں کیا یہ نہیں دیکھتے کہ یہ قبر کتنے مردوں کو ملتی ہے۔ مردوں کی ایک کثیر تعداد کو تو جلا دیا جاتا ہے، جنگلی جانور کھا جاتے ہیں، سمندر میں جانوروں کی غذا بن جاتے ہیں، قوم نوح کے لیے فرمایا "سما خطبتہم اغرقوا۔۔۔" (ان کی خطاؤں کی پاداش میں ان کو غرق کر دیا گیا اور آگ میں ڈال دیا گیا۔ (نوح-۲۵)۔ ان کو یہ دنیاوی گڑھے والی قبریں تو نہ ملیں، بلکہ بعض کی قبریں جنگلی جانوروں کے پیٹ میں تو بعض کی قبریں سمندر کی جانوروں کے شکم۔ تو پھر ان کے عقیدے کے مطابق ان کے لیے عذاب قبر تو "عذاب جنگل" "عذاب سمندر" "عذاب شمشان گھاٹ" ہو کر رہ گیا!۔ ان قبر پرستی کا ذوق رکھنے والوں کو شاید یہ سب منظور ہو گا لیکن قرآن و حدیث پر مبنی "عذاب برزخ" منظور نہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے "ہیروں" کے وقار پر آنچ آجائے اور قبر پرستی کی بنیاد ہی کا اعدام ہو جائے۔ تو یہ ہے حقیقت ان ذہن پرستوں کے عقیدہ عذاب قبر کی!۔ اسی بات کی تقریباً "دو عشرے قبل ڈاکٹر عثمانی نے کچھ اس طرح نشاندہی فرمائی تھی:

"امت کی بد نصیبی کہ آج عذاب قبر کے مسئلے کو فروعی مسئلہ قرار دینے کی کوشش کی جا رہی ہے حالانکہ دنیاوی قبر میں عذاب قبر کا اثبات "حیات فی القبر" کے ہم معنی ہے اور قبر پرستی کے شرک کی اصل بنیاد ہے" (عذاب قبر ص ۲۶)

۳۔ نظریہ حیات فی القبر باطل ہے: الغرض اب یہ اس قوم کی شومی قسمت ہے کہ آج اس کی اکثریت نے اپنے اکابرین کی اندھی پیروی کرتے ہوئے قبر پرستی کی شکل میں جو دین اپنایا ہوا ہے اس کی بنیاد ہی اس باطل عقیدہ پر ہے کہ مرنے والا دفن ہونے کے تھوڑی دیر بعد ہی (اس دنیاوی قبر میں) زندہ ہو جاتا ہے، اس میں روح واپس آ جاتی ہے۔ دراصل ان کو اپنے اکابرین، علماء و فقہاء اور آئمہ پر ایسا اعتماد ہے کہ ان کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ گویا فرمان الہی ہے۔ قرآن کی محکم آیات پر ان کے اقوال کو ترجیح دی جاتی ہے۔ قرآن تو بجا تک دہلی اعلان فرماتا ہے:

۱۔ ثم انکم بعد ذلک لمہتون ○ ثم انکم یوم القیامۃ تبشون ○..... (المومن ۱۲۵)

"پھر اس کے بعد تم کو ضرور موت آئے گی، پھر قیامت کے روز تم اٹھائے جاؤ گے"

یعنی یہ موت کی حالت گھنے دو گھنے یا دو چار دن کے لیے نہ ہوگی بلکہ تا قیامت ہوگی اور تم روز قیامت ہی زندہ کر کے اٹھائے جاؤ گے، اس سے پہلے نہیں۔ سورۃ الزمر میں بھی اس بات پر زور دیا گیا ہے، فرمایا:

۲۔ لیسکالتی قضی علیہا الموت ویرسل الی اخری الی اجل مسمی ط..... (الزمر ۴۲)

"پھر جس پر موت کا فیصلہ نافذ فرماتا ہے اسے روک لیتا ہے اور دوسری ارواح کو ایک وقت مقررہ تک کے لیے واپس بھیج دیتا ہے"

اس آیات نے بغیر ابرام کے اس بات کو ثابت کر دیا کہ مرنے والے کی روح قیامت تک کے لیے (عالم برزخ میں) روک لی جاتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے سورہ مریم میں یحییٰ علیہ السلام کی حکیم فرماتے ہوئے بھی اسی کلیے کا اظہار فرمادیا، ملاحظہ ہو:

۳۔ و سلام علیہ یوم ولدیوم موت و یوم بیعت حی ○..... (مریم ۱۵)

"اور ان پر سلامتی ہے جس دن وہ پیدا ہوئے، جس دن وفات پائیں اور جس دن زندہ کر کے اٹھائے جائیں"

یہاں صاف ظاہر ہے کہ وہ مردہ حالت سے زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے، زندہ کو زندہ کر کے اٹھانا تو بے معنی ہے۔ غور فرمائیے کہ حکیم و قدیر رب نے قیامت کے دن زندہ کر کے اٹھانے کے لیے "خلق جدید" کی اصطلاح استعمال فرمائی ہے:

۴۔ بل ہم فی لبس من خلق جدید ○..... (ق ۵۵)

(مگر قیامت کے روز) ایک نئی تخلیق کی طرف سے یہ لوگ شک میں پڑے ہوئے ہیں) غور فرمائیے! جس طرح وہ "خلق جدید" کے بارے میں شک میں تھے اسی طرح آج یہ فرقہ پرست شک و شبہ کا شکار ہیں۔ جو لوگ قیامت کے دن اٹھائے جانے کو نہیں مانتے ان کو اس دن جتایا جائے گا:

۵۔ لَہٰذَا یَوْمَ الْبَعْثِ وَلَکُمْ کِتْمٌ لَا تَعْلَمُونَ (الروم: ۵۶)

"بعثت کا دن تو یہ ہے لیکن تم لوگ جانتے نہ تھے۔"

اس آیت نے پر زور انداز میں اس بات کو ثابت کیا ہے کہ بعث بعد الموت (موت کے بعد اس لاشے کو زندہ کر کے اٹھائے جانے) کا ایک دن مقرر ہے اور وہ روزِ روزِ قیامت ہو گا۔ درج بالا آیات کے علاوہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے دو موتوں اور دو زندگیوں کا صراحت کے ساتھ کئی ہی جگہ ذکر فرمایا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

۶۔ کَیْفَ تَکْفُرُونَ بِاللّٰهِ وَکُنتُمْ اَسْوَاقًا فَاحِکُم..... تَوَجِعُونَ (البقرہ: ۲۵۰)

"تم کیسے اللہ کا کفر کرتے ہو حالانکہ تم مر رہے تھے اس نے تمہیں زندہ کیا، پھر وہی تمہیں موت دے گا اور پھر (دوبارہ)

زندہ کرے گا پھر (اس کے بعد) تم اس کی بارگاہ میں پیش کئے جاؤ گے۔"

اس آیت نے دو موتوں اور دو زندگیوں کا اثبات کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ قیامت سے پہلے دنیاوی جسم میں روح لوٹا کر تیسری زندگی کا تصور صحیحاً "خلاف قرآن ہے۔ چنانچہ ایسا موقف اختیار کرنا قرآن کا کفر ہو گا۔ جو لوگ آج اس بات کو تسلیم نہیں کرتے وہ قیامت کے دن شدید احساسِ ندامت کے ساتھ خود اقرار کریں گے کہ:

۷۔ لَّا اُولٰٓئِہٖ اٰمَنَاتِنِ وَاحِیَّتِنَا اٰتٰتِنِ لَاعٰزِلُنَا بَلْکُنُوْا اٰفِلٰہٗ اِلٰی خُرُوْجِ مِّنْ مَّیْمَل (النور: ۲۵)

"وہ کہیں گے کہ اے ہمارے رب! تو نے ہمیں دو مرتبہ موت دی اور دو ہی مرتبہ زندگی دی، پس (اب) ہم اپنے

گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں تو کیا یہاں سے نکلنے کا اب کوئی راستہ ہے؟"

ان آیات کے علاوہ اور بھی آیات سے درج بالا موقف کی تائید ہوتی ہے، مثال کے طور پر ملاحظہ ہو سورۃ الحج (۲۲) 'سورۃ الروم (۳۰)۔ ان آیات میں دو زندگیوں اور درمیان میں ایک موت کا تذکرہ ہے۔ الغرض ان آیات مقدسہ سے مسئلہ موت و حیات مطلقاً واضح و ثابت ہو جاتا ہے۔ دو موتوں کا جہاں ذکر ہے ان میں سے ایک عالمِ عدم ہے (حیاتِ دنیا سے قفل کا دورانیہ) اور دوسری موت دنیاوی زندگی میں روح کی جسمِ عسری سے علیحدگی ہے (یعنی دنیوی موت)۔ دو زندگیوں سے مراد ایک تو یہی دنیاوی زندگی ہے (اس جسم میں روح کا آنا) اور دوسری زندگی قیامت کے روز اس دنیاوی جسم کو زندہ کر کے اٹھایا جانا ہے جس کا ذکر قرآن اس طرح کرتا ہے۔

○ "ثُمَّ اَنکُمْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ تَبْعُونَ۔" (پھر تم قیامت کے دن ہی اٹھائے جاؤ گے) (النور: ۲۶)

اور بخاری کی روایت سے اس کی تشریح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ "عجب الذنب" پر جسم کو بنا کر اس میں جان ڈالے گا۔ غور فرمائیے! اس مسئلہ کو قرآن و حدیث نے اس صراحت سے بیان کیا ہے کہ اس میں کسی بھی قسم کے ابہام کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی اور قبر پرستی یا مردہ پرستی کے بنیادی عقیدہ "مردہ روح" یا "حیات فی القبر" کی جڑی کاٹ کر رکھ دی ہے۔ مزید برآں قبروں اور مورتیوں کی شکل میں عیبوں اور ولیوں کو زندہ تصور کر کے استعانت اور استدعا کرنے والوں کو شدت کے ساتھ جھنجھوڑتے ہوئے ان کے "حیاتی عقیدے" پر کیسی بھرپور چوٹ لگائی ہے! ملاحظہ ہو:

۸۔ وَالَّذِیْنَ یَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللّٰہِ..... اَسْوَاقٌ غٰیِرُ اَحْیَاء..... (الاعمال: ۲۰-۲۱)

"اور اللہ کے علاوہ وہ دوسری ہستیائیں جنہیں لوگ (مدد کے لیے) پکارتے ہیں کسی شے کی بھی خالق نہیں بلکہ خود مخلوق

ہیں (موت کے بعد) وہ مردہ ہیں اور ان میں جان کی رمت تک باقی نہیں اور انھیں تو (اپنے بارے میں) یہ شعور بھی نہیں کہ وہ کب (دوبارہ زندہ کر کے) اٹھائے جائیں گے۔

اب تو چوں و چرا کا موقعہ باقی نہ رہا، قرآن نے دو ٹوک فیصلہ فرمادیا کہ مردے ”مردہ“ ہی ہیں زندہ نہیں! ”خواہ وہ نی ہوں یا ولی“ ابراہیم ہوں یا لاث و عزری وغیرہ اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ یہ مردے قیامت کے دن اٹھائے جائیں گے اس سے پہلے نہیں، اور اس گھڑی کا ان کو کوئی شعور نہیں۔ جب قبر پرستی کے ان شاکتین کو چیلنج کیا جاتا ہے کہ قرآن مجید کی چھ ہزار سے زائد آیات میں سے کوئی ایک آیت ہی اپنے عقیدہ کی تائید میں پیش کریں کہ قیامت سے پہلے مردوں کے جسم میں ارواح آجاتی ہیں، معجزات کی بات اور ہے (جو عام قانون سے بالا تر ہوتے ہیں) کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ کے اظہار کے لیے کسی دور میں مردوں کو زندہ کیا ہو ”یا عیسیٰ علیہ السلام کو تجڑہ مٹا کیا گیا اور وہ باذن اللہ معجزے کے طور پر مردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے۔ ان مستثنیات سے بحث نہیں، استدلال تو اصول اور قواعد و قوانین سے ہی ہوتا ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے قرآن میں جگہ جگہ صراحت کے ساتھ بیان فرمادیا ہے۔ تو اس کا جواب دیا جاتا ہے کہ آپ حدیث کو نہیں مانتے!۔ کیسا عجیب انداز ہے ان ”قبر پرست“ روایتی دینداروں کا کہ دلیل کے سامنے زیچ ہو کر بھی ہٹ دھرمی پر اتر آتے ہیں اور التا ہم پر ہی الزام لگاتے ہیں۔ اکابر پرستی اور مسلکی تعصب کی عینک اتار کر دیکھیں تو انھیں صاف نظر آجائے کہ صحیح معنوں میں ہم ہی حدیث کو مانتے ہیں کیونکہ نصوص قرآن پر مبنی یہ موقف صحیح معنوں میں حدیث کا اثبات کرتا ہے نہ کہ انکار! اور اس کی تائید محکم آیات قرآنی آیات اور صحیحین کی واضح و صریح احادیث سے ہوتی ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب اللہ کی درج بالا آیات کی واضح تشریح فرمائی ہے، ملاحظہ فرمائیں۔

ترجمہ: (جس دن صور میں پھونک ماری جائے گی تم لوگ فوج در فوج آؤ گے)

..... ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ صور کی دو پھونکیوں کے درمیان چالیس کا وقفہ ہو گا۔ پوچھنے والے نے کہا کہ چالیس دن کا وقفہ؟ ابو ہریرہؓ نے جواب دیا کہ نہیں کہہ سکتا۔ پھر کہنے والے نے کہا چالیس مہینوں کا وقفہ۔ کہا کہ یہ بھی نہیں کہہ سکتا۔ پوچھنے والے نے پھر کہا کہ کیا چالیس سال کا وقفہ۔ ابو ہریرہؓ نے جواب دیا کہ یہ بھی نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اس بات کو (رسول اللہ علیہ وسلم سے میں نے سنا ہے) کہ اس وقفہ کے بعد اللہ تعالیٰ آسمان سے بارش برسائے گا اور لوگ اس طرح اگ پڑیں گے جیسے سبزہ اگتا ہے۔ انسان کے جسم میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو برباد نہ ہو جائے سوائے ایک ہڈی عجب الذنب کے اور اسی سے جنم انسانی کو پھر بنایا جائے گا۔ (ص ۳۵، ”ظاری“، مطبوعہ دہلی)

۳۔ احادیث سے قرآن کی تائید ہوتی ہے نہ کہ تردید! اس روایت نے کتاب اللہ کی آیات کی تشریح فرمادی کہ انسان کے جسم کا ہر حصہ گل سڑ کے ختم ہو جاتا ہے صرف ”عجب الذنب“ باقی رہ جاتی ہے، قیامت کے روز اسی پر جسم انسانی پھر سے بنا دیا جائے گا۔ غور فرمائیے، قرآن نے دنیاوی زندگی کے بعد قیامت کے روز زندہ ہونے کا جو کلیہ بیان کیا ہے، اس روایت نے اسکی وضاحت کر دی اور اس طرح قرآن و صحیح حدیث سے عقیدہ حیات فی القبر کی تردید ہو گئی۔ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی منصب ہے کہ وہ آیات قرآنی کی تشریح و توضیح کرے نہ کہ تردید۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

○ وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیہم ولعلہم یتفکرون ○ (احق ۴۴)

”اور ہم نے یہ قرآن تم پر نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کو وضاحت کرو ان احکامات کی جو ان کی طرف نازل ہوئے ہیں اور تاکہ وہ غور کریں“

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ کتاب اللہ تو اس انقلابی پیغام کا ماخذ و سرچشمہ ہے جس نے بیچھ ہزار سال قبل کفر و شرک سے آلودہ اس پس ماندہ قوم کے قلب و ذہن کی تطہیر فرمائی اور سیرت و کردار کی اصلاح فرما کے اس کو عز و شرف کی بلندیوں تک پہنچایا زبان نبوت نے اس بات کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا:

○ ان اللہ یرفع بهذا الكتاب اقواما و یضع بهما اخرین..... (اصححہ)

”اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعے قوموں کو بلندی و رفعت عطا فرماتا ہے اور دوسروں کو (یہ کتاب اللہ کو چھوڑ دینے

ہیں) ذلت و پستی میں گرا دیتا ہے (جس طرح یہ نام نداد امت مسلمہ زیوں حالی کا شکار ہے)۔“

اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا تھا کہ وہ اس انقلابی پیغام کو لوگوں تک پہنچائیں، اس کے ذریعے مردہ پرست قوم کے مشرکانہ نظریات اور رسم و رواج کے مطلق جاپناہ نظام پر کاری ضرب لگائیں، ایمان کی کھلی کردعوت دیں اور اس مقدس مشن کو سرانجام دینے میں کسی قسم کی ہدایت نہ کریں۔ اس راہ کی مزاحمتوں اور مخالفتوں کا عزم و صبر کے ساتھ جم کر مقابلہ کریں، قرآن کے ذریعے ”بہیمانہ کبیر“ کا قریضہ انجام دیں۔ قرآن کے الفاظ ہیں۔

○ فلا تظع الکفرین و جاہلہم بہ جہاننا کبرا..... (القرآن ۲۵)

”تم ان کافروں کا گمانہ مانو اور اس (قرآن) کے ذریعہ ان سے سخت جہاد کرو۔“

اب اس مقدس مشن کے حاملین کی رہنمائی کے لیے یہ ذریں اصول ”فلا تظع الکفرین.....“ قیامت تک انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ یہاں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اس دعوت کے مشن کو سرانجام دینے والے کفر و شرک سے آلودہ نظریات کے حامل لوگوں سے قطعاً ”مرعوب و متاثر نہ ہوں بلکہ اللہ کے سچے دین، اسلام کو قرآن و صحیح احادیث کی روشنی میں نافذ العمل کرنے کی جدوجہد میں سرگرم عمل رہیں۔ یہ منکرین قرآن کیسی ہی کوشش کیوں نہ کریں کہ داعی حق کو انحطاط پذیر قوم کے افکار و اقوال اور منکر و موضوع روایات میں الجھا دیں لیکن داعی حق اسی ٹھوس اور ناقابل تردید بنیاد یعنی قرآن و حدیث پر جم کر حق کو واضح کرتے رہیں اور ان اکابر پرستوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان یاد دلائیں کہ ”القرآن حجة لک و علیک“..... (مسلم)

”یعنی قرآن یا تو تمہارے لیے دلیل ہے یا پھر تمہارے خلاف جہت۔“

افسوس ہے تمہارے اوپر کہ ایمان و عقیدہ کی محکم بنیاد قرآن و حدیث کو چھوڑ کر اوہراوہر بھٹکتے پھرتے ہو اور اپنے ”ہیروں“ کے دفاع کے لیے بے حیثیت اقوال و روایات کو جہت و دلیل بناتے ہو۔ تم اس بات کو بھولے ہوئے ہو کہ قیامت کے دن اللہ کے رسول رب ذوالجلال سے شکوہ فرمائیں گے کہ:

○ وقال الرسول یا رب ان قوم اتخنو هذا القرآن سجعورا..... (القرآن ۳۰)

”اور رسول کہیں گے ”اے میرے رب میری قوم نے تو اس قرآن کو یا نکل ہی متروک قرار دے دیا تھا۔“

یعنی انہوں نے قرآن کو تو پچیس پشت ڈال دیا تھا اور اس سے دلیل و رہنمائی حاصل کرنے کی بجائے قرآن کے خلاف دلائل فراہم کرنے میں سرگرواں رہنے لگے تھے۔ یہ بات ذہن نشین کر لی جائے کہ قرآن و حدیث کے نصوص و کلیات سے صرف نظر کر کے کسی آیت قرآنی یا روایت حدیث کا مفہوم اخذ کرنا دینداری نہیں بلکہ صریح گمراہی ہے۔ علم القرآن اور علم الحدیث کا تقاضہ تو یہ ہے کہ قرآن کی آیت اور حدیث کی روایت کی تشریح و توضیح اس طرح کی جائے کہ وہ قرآن و حدیث کے نصوص قطعیہ سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہو جائے۔ اہل علم کا یہی طریقہ کار رہا ہے اور قرون اولیٰ میں اس کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں۔ غور فرمائیے نبی علیہ السلام کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے زیادہ ہمارے لیے کس کا عمل مشغل راہ بن سکتا ہے! بطور نمونہ چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے "قلیب بدر کے واقعہ کے بارے میں عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سن کر اس کا مفہوم قرآنی آیات کی روشنی میں بیان کیا اور فرمایا کہ یہاں سننے سے مراد علم ہے یعنی یہ (مقتولین بدر) اب تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے (دعوت کے دوران کے) فرمودات کو خوب جان گئے ہیں۔ (بخاری و مسلم وغیرہ)۔ اس طرح ام المؤمنین نے حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی قرآن کی روشنی میں وضاحت فرمادی۔

مقام حیرت ہے کہ یہ اکابر پرست حیات فی القبر کے اس باطل عقیدہ کے دفاع کی کوشش میں چند روایات سے قرآن و حدیث کے خلاف مفہوم کشید کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور امت کی قابل صد احترام قیصرہ ام المؤمنینؓ پر صحیح مفہوم بیان کرنے کے جرم میں زبان طعن دراز کرنے سے بھی نہیں بچتے اور ان کو اپنے بیڑوں کے مقابلہ میں معذوریات ناقص القسم قرار دے ڈالتے ہیں حیف صد حیف! حالانکہ ناقص القسمی اور کوتاہ نظری ہی نہیں بلکہ بدترین گمراہی اور جہالت کا شکار یہ خود ہیں جو قلیب بدر والی روایت کے الفاظ اور عائشہؓ کی طرف سے قرآنی تعلیمات کے مطابق اس کی وضاحت کو بنیاد بنا کر سماع موتی کے شرکانہ عقیدے اور قبر پرستی کے دیومالائی نظام اور اس کے کارپردازوں کے تحفظ کے لیے لوگوں کو یہ مغالطہ دینے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں کہ سماع موتی کے معاملے میں صحابہ کرامؓ کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ جبکہ اس کے برعکس یہ بالکل واضح، دو ٹوک اور ناقابل تردید حقیقت ہے کہ صحابہ کرامؓ بالاتفاق سماع موتی کے شرکانہ عقیدے کی تردید کرتے ہیں۔ حدیث کے الفاظ میں عبد اللہ بن عمرؓ اس واقعہ کو نبی علیہ السلام کے معجزے کے طور پر پیش کرتے ہیں جو ظاہر ہے عام اصول اور قاعدہ نہیں بلکہ استثنائی صورت ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ نے کفار و مشرکین کو معجزانہ طور پر زندہ کر کے مزید ذلیل و رسوا کرنے کے لیے ان کو نبی علیہ السلام کی باتیں سنوائیں۔ جبکہ عائشہؓ کی وضاحت کے مطابق کفار و مشرکین نے اللہ کے عذاب کو نبی علیہ السلام کی وعید کے مطابق "ذلت و رسوائی سے دو چار ہو کر" عملی طور پر دیکھ اور جان لیا۔ اور یہی دراصل وہ مستقل کیفیت ہے جس میں وہ برزخ کے دوران قیامت تک رہیں گے۔ چنانچہ مذکورہ بالا آراء سے جو بات بغیر کسی شائبہ اختلاف ثابت ہو رہی ہے وہ یہ ہے کہ سماع موتی کا عقیدہ قرآن و حدیث کے خلاف ایک شرکانہ عقیدہ ہے اور یہ کہ اس کے رد میں صحابہ کرامؓ کتاب و سنت کی تعلیمات کے مطابق یک زبان ہیں ان کے اندر کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ صحابہؓ کے درمیان اختلاف کی بات محض ایک چمک آمیز موشگافی اور آخرت سے بے خوف مولو لیا نہ چالاکی کا شائبہ ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں۔ یہ دیومالائی نظام اور اس کے سرپرستوں کی حفاظت کے لیے ان کے پرستاروں کی تمناؤں پر مبنی ریت کی دیوار ہے۔ غالباً ایسے ہی بوڑے ساروں پر کھڑے لوگوں کے لیے اللہ کی کتاب تبصرہ فرماتی ہے

تلك اسانيهم لا قل باتوا بهنكم ان كنتم صادقين (البقرة)

(۲) اسی طرح لوگوں کی آہ و بکا کرنے پر مرزوں کو عذاب کے بارے میں جب عبد اللہ بن عمرؓ اور عمرؓ کی روایات کا ام المؤمنین سے ذکر کیا گیا تو آپ نے روایات کا صحیح مفہوم قرآن و حدیث کی روشنی میں بیان فرمادیا۔ ابن عباسؓ نے عمرؓ کا واقعہ بیان کرتے ہوئے بتایا کہ جب عمرؓ کو زخمی کیا گیا تو صیبؓ آہ و بکا کرنے لگے۔ عمرؓ نے انہیں منع کیا اور کہا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میت کو البتہ اس کے بعض اعزہ کے رونے کے سبب عذاب دیا جاتا ہے۔" ابن عباسؓ نے ان کی وفات کے بعد اس واقعہ کا ذکر عائشہؓ سے کیا تو انہوں نے کہا "اللہ عمرؓ پر رحم فرمائے۔ اللہ کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث یہ نہیں ہے کہ میت کو اس کے عزیزوں کے رونے کے سبب عذاب دیا جاتا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کافر کی میت پر ان کے رونے کے سبب عذاب زیادہ کر دیا جاتا ہے۔" پھر ام المؤمنینؓ نے اپنے اس موقف کے ثبوت میں قرآن کی آیت تلاوت فرمائی "ولا تنزدوا ذرؤہ و ذرؤہ" (یعنی کوئی شخص دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا)۔ ابن عباسؓ نے ام المؤمنین کی بات ابن عمرؓ کے سامنے بیان کی تو انہوں نے خاموشی اختیار کی یعنی اس وضاحت سے اتفاق کیا۔ (بخاری و مسلم وغیرہ)۔

۵۔ آیات و روایات کی تشریح توضیح نصوص قطعیہ کے مطابق کی جائے گی: قرآن و حدیث میں اس پر بے شمار مثالیں موجود

ہیں، یہاں صرف چند بطور نمونہ پیش کی گئی ہیں جو اس اصول کو واضح کرنے کے لیے کافی ہیں کہ احادیث صحیحہ قرآن مجید و فرقان حمید کی تفسیر (تائید و تشریح) کرتی ہیں نہ کہ کلام اللہ کی تردید (العیاذ باللہ!)۔ اہل علم میں یہی اصول کار فرما رہا ہے اور دور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی درج بالا مثالیں بھی اس کی تائید کرتی ہیں۔ اب یہ ان مدعیان "حیات فی القبر" کی مجبوری ہے کہ ان کو اپنے اور اپنے بزرگوں کے عقیدے کی تائید میں نہ تو کوئی قرآن کی آیت ملتی ہے اور نہ صحیح احادیث بلکہ ان کے پاس منکر و موضوع روایات کا ڈھیر ہے۔ جب ان کو سمجھایا جاتا ہے کہ عقائد کا دار و مدار تو محکم آیات قرآنی پر ہی ہونا چاہیے اور احادیث صحیحہ اس کی تائید و تشریح میں پیش کی جانی چاہئیں۔ نصوص کا قرآن و حدیث کے خلاف مفہوم اخذ کرنا مناسب نہیں، کیونکہ یہ تو قرآن و حدیث کے انکار کے مترادف ہو گا تو بات سمجھنے کی بجائے ہٹ دھرمی کے ساتھ فتویٰ صادر فرما دیتے ہیں کہ آپ مذاہب قبر نہیں مانتے، آپ صحیح احادیث کو نہیں مانتے۔ آخر ہمیں تاویل و تشریح کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ لیکن دلچسپ بات تو یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے اس اصول اور موقف پر جتنے بھی نہیں، مثال کے طور پر جب ہم ان کے سامنے صحیح بخاری کتاب الرقاق، باب التواضع کی روایت پیش کرتے ہیں جس میں نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "میرا بندہ برابر تو نوافل کے ذریعے مجھ سے تقرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس کے کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے، پیر بن جاتا ہوں جس سے وہ چمکتا ہے۔"

اب اگر ان سے کوئی پوچھے کہ کیا آپ اس روایت سے صوفیوں کے نظریہ وحدت الوجود (حلول) کی تائید کرنا پسند کریں گے؟ تو فوراً جواب دیں گے "ہرگز نہیں" اس کی تاویل کی جائے گی۔ "ان کو معلوم ہو کہ صوفی تو اسی روایت سے اپنے اور اپنے پیروں کے نظریے "حلول" کا دفاع کرتا ہے اور یہ ان کے استدلال کی اہم بنیاد ہے۔ وہ بھی تو اسی طرح کہتا ہے کہ آخر ہمیں تاویل کی کیا ضرورت ہے!! ان کے طرز استدلال کی بے بضاعتی ثابت کرنے کے لیے تو یہ تقابلی کافی ہونا چاہیے، لیکن ہم قرآن سے بھی اس کی مثال پیش کئے دیتے ہیں تاکہ چون و چرا کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے غزوہ بدر پر ہجرہ کرتے ہوئے فرمایا۔

○ وَمَا مِثْلَهُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِئٌ بِهِمْ ۖ (الأنفال: ۱۷)

(اے نبی! جس وقت تم نے نکلیاں جھینگی تمہیں، وہ تم نے نہیں جھینگی بلکہ اللہ نے پھینکی تمہیں.....)

کیا موصوف اس آیت کا وہ مفہوم لیں گے جس سے "عاشقانِ رسول" کے عقیدے کی تائید و تصدیق ہو اور "احمد" اور "احمد" کا فرق باقی نہ رہے؟ (العیاذ باللہ!) شاید یہ مدعیان "حیات فی القبر" اس سے اتفاق نہ کریں، مزید ملاحظہ فرمائیں۔ اسی آیت کے پہلے حصہ میں فرمایا:

○ فَلَمَّ تَقْتُلُوهُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ قَاتِلُهُمْ ۖ (الأنفال: ۱۷)

"(اے مومنو!) تم نے کفار کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو قتل کیا تھا۔"

یہاں بھی موصوف کو نظریہ "حلول" سے بچنے کیلئے آیت کی تشریح قرآن و حدیث کے مطابق ہی کرنا پڑے گی۔ مزید ملاحظہ ہو "سورۃ الفتح" میں اللہ تعالیٰ نے "بیعت رضوان" کی منظر کشی کرتے ہوئے فرمایا:

○ اِنَّ النَّبِيْنَ بَايَعُوْكَ اِنَّمَا يَبَايَعُوْنَكَ بِاللّٰهِ ۚ يَدُلُّهُمُ اللّٰهُ فَاَتَمُّوْا اَبْرَارِهِمْ ۚ (الفتح: ۱۰)

"(اے نبی!) جو لوگ تم سے بیعت کر رہے تھے وہ دراصل اللہ ہی سے بیعت کر رہے تھے، ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ تھا۔" یہاں یہ ذہن نشین کر لیا جائے کہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے نبی علیہ السلام اور مومنین صادقین کی سرفروشی اور جان نثاری کے واسطے انداز کی انتہائی فصیح و بلیغ ادبیانہ انداز میں قدر وائی فرمائی ہے اور یہ محبوب بندوں کی حکیم کاوشی انداز ہے جو بخاری (کتاب الرقاق) کی محولہ بالا عبارت میں ملتا ہے۔ بہر حال اب تو ان کو اس اصول کو تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ کار نہیں کہ آیات و روایت کی تشریح و تاویل نص قطعی کے مطابق ہونا ضروری ہے ورنہ گمراہی کا شدید خطرہ ہے۔ ہماری توقع کے مطابق اگر یہ اس موقف کو بخوشی تسلیم کر لیں تو پھر ان سے

درمندانہ گزارش ہے کہ موضوع و منکر روایات کی بنیاد پر اختراع کردہ عقیدہ ”عود روح“ یا ”حیات فی القبر“ سے رجوع کر لینے کی اپنے اندر ہمت پیدا کریں کیونکہ یہ قرآن و حدیث کے نصوص و کلیات کے یکسر خلاف ہے اور قبر پرستی کی شکل میں بت پرستی کے دین کی بنیاد ہے۔ چنانچہ قرآن و حدیث کی تعلیمات میں تطبیق کے غیر متنازعہ اصول کے مطابق ایسا یکساں اور مضبوط موقف اختیار کریں جو کسی طرح بھی کفر و شرک پر مبنی نظریات کا موند نہ ہو۔ اس طرح حق کی حمایت میں اس کی گواہی دینے کے لیے کھڑے ہوں اور بے دینی و گمراہی پھیلانے والے طواغیت کا دفاع کرنے کی بجائے ان سے برات کا اظہار کریں، دین خالص کا یہی تقاضہ ہے۔ یہ بات آج نہ سمجھے تو کل سمجھنا سود مند نہ ہوگا اور ”ہل الی خروج من سبیل۔۔۔“ کی درخواست قبول نہ کی جائے گی، شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات۔ بصورت دیگر تو ان کے بارے میں یہی کہا جائے گا کہ یہ ”ذوالوجہین“ دہرے معیار کے حامل ہیں، قرآن و حدیث کے مطابق تاویل و توضیح کو اسی حد تک ضروری خیال کرتے ہیں جب تک کہ ان کے اکابرین کے عقائد پر چوٹ نہ پڑے۔ جب اکابرین کا معاملہ درمیان میں آجائے تو یہ موضوع و منکر روایات کو محکم آیات قرآنی اور احادیث صحیحہ پر ترجیح دینے میں ذرا بھی ہجک محسوس نہیں کرتے۔ چنانچہ ”طلول“ کے عقیدہ کو رو کرنے کے لیے آیات و روایات کی صحیح تاویل و تشریح پر شد و مد سے زور دیتے ہیں لیکن جب معاملہ ”حیات فی القبر“ کا ہو تو ظاہراً الفاظ کو ہی دانتوں سے پکڑتے ہیں اور اس باطل عقیدہ کی حمایت و مدافعت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں!۔ یہ اس بات کو مانیں یا نہ مانیں لیکن ہم اس کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں کہ جس طرح تصوف کے شاہکار وحدت الوجود (طلول و شمو) نے امت کے اندر فساد و بربادی پھیلانی ہے۔ اسی طرح عقیدہ عود روح یا حیات فی القبر نے قبر پرستی کی عمارت کو استوار کر کے دین و ایمان کا جنازہ نکال دیا ہے! اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ دونوں نظریے ایک ہی پالنے میں پروان چڑھے ہیں، ایک ہی جڑ (شرک) سے نکلے ہوئے شجر خبیث کی دو شاخیں ہیں۔

۶۔ یہ نفس پرست مقلدین: درج بالا طور میں یہ بات کچھ تفصیل سے آچکی ہے کہ ان فرقہ پرستوں کا اصل مسئلہ عذاب قبر نہیں بلکہ اس مردہ بابا کو زندہ رکھنا ہے تاکہ قبر پرستی کا کاروبار چلتا رہے اسی لیے اس دین کے علیبر واریہ انداز اپنائے ہوئے ہیں کہ قرآن و صحیح احادیث پر مبنی صحیح موقف اختیار کرنے کے بجائے آئمہ ضلالت کے ایجاد کردہ باطل عقیدے سے چپے رہیں اور حتی المقدور اس کے دفاع میں سرگرم رہیں۔ انہی میں ایک مسعود احمد صاحب بی۔ ایس۔ سی ہیں جو جماعت المسلمین کے نام کو اپنی شہرت کا ذریعہ بنائے ہوئے ہیں۔ ان کے عقائد اور ان کا انداز فکر و عمل تقریباً ”مسک اہل حدیث کی طرح ہی ہے۔ محض نام تبدیل کر کے یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ انہوں نے کوئی بڑا کارنامہ کر دکھایا ہے۔ انہوں نے اپنی تفسیر قرآن عزیز جلد بیستم میں سورۃ ابراہیم کی تفسیر میں عذاب قبر کے حوالے سے طویل بحث کی ہے“ اس کا یہاں اجمالی جائزہ پیش کیا جاتا ہے لیکن اس سے قبل یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ مسعود صاحب ایک طرف تو یہ اصول بیان کرتے ہیں کہ صحیح سند سے آنے والی روایت کا متن قرآن کی محکم آیت کے خلاف ہی کیوں نہ محسوس ہو اس کی تاویل و تشریح کرنے کی ضرورت نہیں، الفاظ سے ہی مفہوم لیا جائے۔ لیکن خود بوقت ضرورت حدیث کی مختلف تاویلات کرتے ہیں اور بجائے تاویل کے ”تطبیق“ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ (اس کی متعدد مثالیں ان کی کتابوں سے پیش کی جاسکتی ہیں) تاویل و تشریح تو ہوتی ہی تطبیق کے لیے ہے لیکن یہ جداگانہ اصطلاح استعمال کر کے اپنے لئے جواز پیدا کر لیتے ہیں اور بزم خویش سمجھتے ہیں کہ یہ تاویل کرنے میں حق بجانب ہیں۔ کیسی بوجھبھی ہے یہ کہ اپنے لیے ایک معیار ہے تو دوسروں کے لیے دوسرا معیار!۔ ستم بالائے ستم یہ کہ کبھی کبھی اپنے مقصد کے حصول کے لیے حدیث کا ترجمہ تک بدل ڈالنے میں تامل نہیں کرتے اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے مالیت کی بیکار بیکاری وہ اہل روزنا میں ہے۔
ایک شخص نے کہا اے اللہ کے رسول! اگر وہ نماز پڑھے اور روزے رکھے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

نے فرمایا اگر میرے فارغ سے اور روزے رکھے نہ ہو تو آیا قاتل قتلہ غازی اللہ الذی شہد بحکمہ
 المسلمین من الشواہد فی عباد اللہ؟ (مسلین) اس کی تہ سے پکارو جس تہ سے اللہ
 نے جس نے تمہارا نام مسلمان رکھا ہے، پکارا ہے، یعنی تمہیں اللہ کے بندے (امام فرزدی) نے
 اللہ اللہ جب اللہ تک کہنے کے لئے کہ امانت میں تو نام بدل کیجئے ہمارے ہو سکتا ہے، لیکن
 عکس (ہمارا نام صرف ایک یعنی مسلم) ص ۳۸

ایک اہل حدیث حافظ محمد سلیمان نے اس کا درج ذیل جواب دیا "ملاحظہ ہو۔

مسعود صاحب پر فارسی کی کماوت صادق آتی ہے۔ چہ و لا دراست ذروے کہ دروست چراغ دارو۔ انہوں نے یہ ترجمہ
 اللہ تعالیٰ کا خوف دل سے نکال کر کیا ہے۔ ایک معمولی عربی جاننے والا شخص بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ المسلمین "المؤمنین"
 عباد اللہ متینوں اسم معاکم کے بعد آئے ہیں۔ اگر نام ہیں تو متین نام ہیں۔ اگر القاب ہیں تو متینوں کا ایک ہی حکم ہے مگر
 مسعود صاحب نے بڑی اہمائی سے مسلمین کو نام مؤمنین اور عباد اللہ کو القاب بتایا ہے تاکہ انھیں کوئی یہ نہ کہہ سکے
 مسلمین نام سے جماعت المسلمین بتائی ہے تو مؤمنین نام سے جماعت المؤمنین کیوں نہیں بتاتے عباد اللہ نام سے جماعت
 عباد اللہ قائم کیوں نہیں کرتے۔ (الفرقۃ لایات ص ۳۸)

تو مسعود احمد صاحب نے اس کا یہ جواب دیا ہے "ملاحظہ فرمائیے۔

جواب | یہ ترجمہ کس طرح صحیح ہو سکتا ہے جبکہ قرآن مجید میں صرف "هُوَ تَشْكُمُ

الْمُسْلِمِينَ" (الحج - ۷۸) ہے۔ قرآن مجید میں کہیں بھی "هُوَ تَشْكُمُ

الْمُسْلِمِينَ" یا "هُوَ تَشْكُمُ عِبَادَ اللَّهِ" نہیں ہے۔ (عکس المیزان ص ۳۸)

ملاحظہ فرمایا، حصول مقصد کے لئے ترجمہ ہی بدل ڈالا۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ ہم صحیح تفسیر کے ساتھ قرآن و حدیث کے مطابق تشریح
 کریں تو مجرم قرار دئے جائیں اور یہ ترجمہ غلط کریں تو ان کے لئے جائز ہے "اس لئے کہ صحیح ترجمہ ان کی نظر میں خلاف قرآن ہے۔ کیا ان
 کے مقلدین میں سے کسی میں بھی اتنی جرأت نہیں جو اپنے علامہ صاحب کو ان کی بے باکی اور آخرت سے بے غوفی پر ٹوک سکے؟ تقریباً
 یہی انداز منکرین حدیث کا ہے جو انکار حدیث کے مقصد سے آیات قرآنی کے معنی و مطالب میں حسب دلخواہ تحریف کر لیا کرتے ہیں۔

مسعود احمد صاحب نے عذاب قبر کی اس بحث میں گھمبھن کی جتنی روایات پیش کی ہیں ان میں جسم میں روح لوٹانے کا تو کوئی تذکرہ ہی
 نہیں، حالانکہ سوال و جواب اور عذاب و راحت کا معاملہ جسم اور روح دونوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اب ان کے نظریے کے مطابق تو یہ
 سب کچھ اس دنیاوی گڑھے میں اس لاش کے ساتھ ہی ہوتا ہے تو پھر انھیں پہلے "موجود روح" ثابت کرنا پڑے گا کیونکہ یہ ان کے لئے مسئلہ
 نمبر ایک ہے۔ لیکن یہ لوگ اس سے فرار کی راہ اختیار کرتے ہیں کیونکہ ان کے پاس قرآن کی محکم آیات کے مقابلے میں نہ تو کوئی قرآن کی
 آیت ہے اور نہ صحیح حدیث، لہذا ہڈی چا بکدستی سے اس مسئلہ کو کھما کر "عذاب قبر" کے ہی ثبوت میں احادیث لا کر بحث کو طول دینے کی
 کوشش کرتے ہیں اور آخر میں نتیجہ یہ نکال دیتے ہیں کہ گویا اس ارضی قبر (دنیاوی گڑھے) میں عذاب و راحت ثابت کر دکھایا۔ ہم نے تو
 متعدد بار اس بات پر زور دیا ہے کہ عذاب قبر حق ہے، یہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے اور سلف صالحین کا ہمیشہ متفقہ موقف رہا ہے اور اس
 کا انکاری بلاشبہ کافر ہے۔ لیکن اصل مسئلہ جو باعث نزاع ہے وہ قیامت سے پہلے مردے کے جسم میں "روح کا لوٹ آنا ہے" اور اس کے
 لئے ان کے پاس نہ تو قرآن کی کوئی آیت ہے اور نہ کوئی صحیح حدیث! دوسری بات یہ کہ سوال و جواب اور عذاب و راحت کا معاملہ ان
 لاشوں کے ساتھ کیسے ہو سکتا ہے جن میں سے اکثر کو یہ زمینی گڑھا (ارضی قبر) ملتا ہی نہیں کیونکہ اکثر کو جلا دیا جاتا ہے، بعض جانوروں کی

نذاہن جاتے ہیں یا کسی میوزیم کی زینت 'سائنسی تجربات و مطالعے کے لیے یا لوگوں کی عبرت نگاہی کے لیے (فراغت کی میمنہ کی طرح) یا کبھی لاشے پوسٹ مارٹم کے لیے قبر سے نکال لیے جاتے ہیں۔ جن لاشوں کو یہ گڑھا ملتا بھی ہے تو وہ کچھ عرصہ کے بعد اس گڑھے میں گل سڑ کر مٹی ہو کر مٹی میں مل جاتے ہیں (سوائے عجب الذنب کے)۔ لاشوں کا گل سڑ کر مٹی میں مل جانا قرآن و حدیث سے ثابت ہے اور اس کا انکار کرنے والا بھی بلاشبہ کافر ہے۔ اب یہ مدعیان حیات فی القبر ذرا اس بات پر غور جانیدار اندہ غور کر لیں کہ کیا یہ عذاب و راحت کا معاملہ کچھ مخصوص لوگوں کے ساتھ ہی ہوتا ہے (جن کو یہ گڑھا ملتا ہے) اور کیا یہ صرف محدود مدت کے لیے ہوتا ہے یا گلے سڑے لاشوں اور مٹی میں ملے ذرات کے ساتھ ہی ہوتا رہتا ہے! قرآن و حدیث سے تو یہ ثابت ہے کہ یہ معاملہ سب کے ساتھ ہے 'انبیاء و شہداء اور صلحاء کے لیے جنت کی راحتیں اور فاسقوں کے لیے آگ کا عذاب قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ شہداء کے اڑنے والے قالب کا ذکر حدیث میں موجود ہے اور عمرو بن لُحی الخداعی کے آنسوؤں والے جسم کا بھی بخاری میں ذکر ہے 'اور یہ بھی واضح ہے کہ یہ سلسلہ عذاب و راحت قیامت تک جاری رہے گا جبکہ اللہ تعالیٰ عجب الذنب پر دوبارہ جسم بنا کر اس میں روح ڈال کر اٹھا کھڑا کرے گا اور حساب و کتاب کے لیے میدان حشر میں جمع کرے گا۔ تو کیا ان اندھے مقلدین کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ انبیاء و شہداء اور صلحاء کے جنتی جسموں کا یا عمرو بن لُحی الخداعی اور فراعنہ وغیرہ کافروں و مشرکوں کے جنتی جسموں کا ان ارضی قبروں کے گلے سڑے لاشوں اور مٹی میں ملنے والے ذرات سے قطعاً 'کوئی تعلق نہیں' اور تعلق ہو بھی کیسے سکتا ہے 'وہ عالم برزخ میں ہیں اور یہ ان دنیاوی قبروں میں!۔ یاد رکھیے 'رب ذوالجلال کی بات "ومن ورائہم یوم یوم یوم" ہر گز غلط نہیں ہو سکتی۔ اس کے خلاف عقیدہ و موقف اپنانے والے بلاشبہ جھوٹے ہیں اور شیطان کے آلہ کار۔ ان کے اندھے مقلدین نفس پرستی کا شکار 'کبھی تو موضوع و منکر روایات کا سہارا لیتے ہیں اور کبھی صحیح احادیث کی غلط تاویلات کا۔ اس کا مختصر جائزہ درج ذیل طور میں پیش کیا گیا ہے 'ملاحظہ ہو:

۷۔ صحیح حدیث کی صحیح تاویل: سواء السبیل سے بھٹکنے والے ان مدعیان حیات فی القبر کی دشواری یہ ہے کہ قرآن و صحیح احادیث سے رہنمائی حاصل کرنے کی بجائے اپنے اکابرین کے باطل عقیدے کے دفاع میں موضوع و منکر روایات کو دانتوں سے پکڑتے ہیں اور اپنے استدلال کی بنیاد بناتے ہیں اور پھر صحیح روایات کی غلط تاویل کے ذریعے باطل موقف کو تقویت پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ مسعود احمد صاحب نے اسی کوشش میں مذکورہ تفسیر کے صفحے کے صفحہ سیاہ کروئے ہیں۔ مثال کے طور پر ص ۳۵ پر بخاری کی درج ذیل روایت پیش کر کے اس کو ارضی قبر میں عذاب و راحت کی دلیل بناتے ہیں:

○ ان العباد اذا وضع فی قبرہ و تولی عنہ اصحابہ.....

(جب بندہ اپنی قبر میں رکھا جاتا ہے اور اس کے اصحاب اس سے پیٹھ موڑتے ہیں....)

اسی طرح ایک دوسری روایت کے الفاظ ہیں:

○ اذا دخل الانسان قبرہ..... (جب انسان قبر میں جاتا ہے....)

اس قسم کی روایت سے قرآن و حدیث کے خلاف ارضی قبر میں عذاب و راحت کے لیے "عود روح" کے نظریے کا استنباط کرنا سراسر حماقت ہے۔ گذشتہ صفحات میں بتایا گیا کہ ان کی اکثریت کو نہ یہ گڑھا ملتا ہے نہ دفن کرنے والے اصحاب 'جن کے جو توں کی چاپ (یہ مروے) سن سکیں 'تو کیا وہ سب سوال و جواب و عذاب و راحت کے مرحلہ سے مستثنیٰ ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ یہ نہ تو ارضی قبر میں رکھے گئے نہ داخل ہوئے۔ جیسا کہ حدیث کے الفاظ ہیں کہ اسی وقت یہ معاملہ شروع ہوتا! نہیں ہرگز نہیں۔ نوح علیہ السلام کی پوری قوم پانی کے طوفان میں غرق کردی گئی کسی ایک کی بھی ارضی قبر نہ بنی لیکن وہ عذاب سے نہ بچ سکے۔ مالک ذوالجلال کا فرمان کہ "انھو فوالا فادخلوا" (نوح ۴۵) (غرق کئے گئے اور آگ میں ڈال دئے گئے) یعنی اوہ غرق ہوئے ادھر آگ میں ڈالے گئے (بغیر تاخیر و توقف کے)۔ قوم

نوح کے مردوں کو نہ ارضی قبریں ملیں نہ دفن کرنے والے ملے جن کے پیروں کی وہ چاپ سنتے۔ اسی طرح ایک بڑی اکثریت کو جلا دیا جاتا ہے اکثر درندوں پرندوں اور بحری جانوروں کی خوراک بن جاتے ہیں وہ کس کے پیروں کی چاپ سنتے ہیں؟ کیا فوری طور سے ان کی قبریں جانوروں کے پیٹ بن گئے؟ جٹے ہوئے لاشوں کے منتشر ذرات کی ارضی قبر تو "موجود" نہ رہی بلکہ "معدوم" ہو گئی اسی طرح قوم نوح کے مردوں کی ارضی قبر بھی معدوم ہو گئی۔ مسعود احمد صاحب کی لفاظی اور استدلال کی بے بضاعتی ملاحظہ ہو فرماتے ہیں:

"بندہ ارضی قبر میں رکھا جاتا ہے اور یہ حقیقت ہے۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کسی دوسری قبر کے وجود کا

کوئی قرینہ نہیں۔ موجود قبر کے ہوتے ہوئے غیر موجود بلکہ معدوم قبر کا تصور قطعاً باطل ہے" (نور ص ۲۳۵)

ان کو حقیقت کا علم اب تو ہو جانا چاہیے کہ ہر بندہ ارضی قبر میں نہیں رکھا جاتا لیکن ہر ایک کے لیے قبر اور ہر فاسق و فاجر کے لیے عذاب قبر مقرر ہے یعنی ہر ذی روح کے لیے موت اور ہر مرنے والے کے لیے قبر لازم ہے اور یہی حقیقت نفس الامر ہے چنانچہ فرمایا:

○ ثم اساتذہ القبر..... (مس ۲) (پھر انسان کو موت دی اور ساتھ ہی قبر دی جاتی ہے)

در اصل یہ ہے وہ حقیقی قبر جو ہر ایک کے لیے مقرر ہے اور جو مرنے کے فوراً بعد مل جاتی ہے اور یہ موت کے ساتھ لازم و ملزوم ہے۔ یہی ارضی قبر تو یہ دنیاوی گڑھا ہے جو ہر ایک کو نہیں ملتا۔ حدیث کے مطابق جو توں کی چاپ کا معاملہ سوال و جواب اور عذاب و راحت کا معاملہ اسی حقیقی قبر میں ہوتا ہے اور قیامت تک یہ سلسلہ جاری رہے گا خواہ ارضی قبر بنی ہو یا نہ بنی ہو اور بنی بھی ہو تو حوادث و دوراں کی نذر ہو جائے۔ اصل قبر عالم برزخ میں ہے کیونکہ مرنے کے بعد اس دنیا سے تعلق یکسر ختم ہو جاتا ہے اور مرنے کے بعد کے تمام احوال انبیاء شہداء و صالحین اور فاسقین کے عالم برزخ کے احوال ہیں جن کا دنیا اور اس کے معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لہذا بخاری کی درج بالا روایت میں مذکور واقعات کا تعلق عالم برزخ سے ہی ہے۔ چنانچہ محدثین نے چاپ سننے کے الفاظ کی جو وضاحت کی ہے اس سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے۔ بعض نے کہا کہ یہ محض کنایہ ہے اور قبر کا معاملہ واقع ہونے کی جگہ کی طرف اشارہ کرتا ہے تو بعض نے اس سے فرشتوں کے پیروں کی چاپ مراد لیا ہے۔ الغرض اس سے ارضی قبر میں نبات اور سوال و جواب ثابت کرنا سخت جہالت و ہٹ دھرمی ہے اور قرآن و حدیث کے یکسر خلاف ہے۔ اسی طرح ص ۳۸ پر موصوف نے مسلم کی ایک روایت پیش کی ہے جس کے الفاظ ہیں:

"ان هذه القبور....." (بے شک یہ قبریں اندھیروں سے پر ہوتی ہیں..... الخ)

اس روایت سے موصوف نے بڑے زور و شور سے یہ استدلال کرنے کی کوشش کی ہے کہ نبی علیہ السلام نے "ان هذه القبور" کہہ کر گویا قبر کو متعین فرما دیا ہے حالانکہ یہ محض عند ذہنی کا معاملہ ہے (یعنی ذہن میں موجود شے یا شخص کے لیے اشارہ قریب استعمال کر لینا جبکہ وہ قریب نہ ہو لیکن سننے والا مفہوم کو سمجھ لے)۔ اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ بخاری کی روایت کے مطابق ہر قل والی روم نے کہا تھا:

○ انی سائل ہذا عن هذا الرجل

(میں اس شخص یعنی ابوسہیان سے اس شخص یعنی محمد کے بارے میں پوچھوں گا)۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو اس وقت روم سے سینکڑوں میل دور مدینہ میں تھے لیکن ان کے لیے گفتگو میں اشارہ قریب "ہذا" استعمال کیا گیا۔ الغرض روایت میں آئے ہوئے لفظ "ہذا" سے اپنے مطلب کا مفہوم اخذ کر لینا یہ قریب جہالت ہے اور فہم حدیث کے نقد ان کی علامت۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "عذاب برزخ" ڈاکٹر عثمانی ص ۱۱ تا ۲۲ اور ایمان خالص قسط دوم ص ۲۳ تا ۲۴)۔ البتہ اس سے ان کے استدلال کی بے بضاعتی ثابت ہو جاتی ہے کہ کس طرح باطل موقف کی تقویت کے لیے ٹکوں کا سہارا لیتے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ گمراہی سے اپنے آپ کو بچائیں اور صحیح سند سے آنے والی روایات کی تشریح و توضیح قرآن و حدیث کی روشنی ہی میں کریں۔ قرون اولیٰ سے اہل علم نے ہمیشہ ہی انداز اختیار کیا ہے۔ بعض روایات کے معاملہ میں تو یہ مدعیان حیات فی القبر بھی اس اصول کو اپناتے رہے جیسا کہ

اوپر اس روایت کا حوالہ دیا جا چکا ہے کہ جس میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ وہ مومن بندہ کا ہاتھ بن جاتا ہے، پاؤں بن جاتا ہے وغیرہ (بخاری کتاب الرقاق)۔ اسی طرح ایک دوسری روایت ہے جس میں مردہ کے چارہائی پر یا کاندھے پر بولنے کا ذکر ہے جس کے الفاظ تو ان کے عقیدہ کے بھی خلاف ہیں۔ ان تمام روایتوں کی یہ سب ہی تاویل کرتے ہیں اور کوئی بھی بعینہ الفاظ سے مفسوم اخذ نہیں کرتا، پھر ان کو ان چند روایات کی صحیح تاویل کر کے قرآن کے ساتھ تطبیق پیدا کر لینے میں نہ معلوم کیا قباحت محسوس ہوتی ہے کہ اس کے بعد تو یہ اشکال کا اعدام ہو جاتا ہے اور یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ سوال و جواب اور عذاب و راحت کا مقام برزخ ہے نہ کہ یہ ارضی قبر۔ اس مسئلہ حقیقت کی تائید میں بے شمار واقعات احادیث میں مذکور ہیں جن میں سے چند یہاں پیش کئے جاتے ہیں، ملاحظہ فرمائیں:

1۔ ہجرت کے بعد مدینہ میں جس جگہ مسجد نبوی تعمیر ہوئی وہاں مشرکوں کی قبریں تھیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو حکم دیا کہ ان قبروں کو اکھاڑ دیا جائے (بخاری)۔ غور فرمائیے کہ اگر ان ارضی قبروں میں عذاب و راحت ہو رہا ہو تو ان کو اکھاڑنے کا حکم نہ دیا جاتا۔ نبی علیہ السلام کو ان مشرکوں پر عذاب ختم کرانا تو مقصود نہ تھا سوچنے کی بات ہے کہ کیا قبریں ختم ہونے کے بعد وہ مشرک عذاب سے بچ گئے؟۔ ظاہر ہے کہ ان قبروں کا یا ان میں مدفون لاشوں کا عالم برزخ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اسی لیے نبی علیہ السلام نے بلا پس و پیش ان کو ختم کرا دیا۔

II۔ صحیح بخاری میں ایک شخص کا واقعہ مذکور ہے کہ جب وہ اسلام لایا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کاتب مقرر ہوا۔ پھر وہ مرتد ہو گیا اور نبی علیہ السلام کے خلاف پروپیگنڈا کرنے لگا۔ جب اس کی موت واقع ہوئی اور اس کو دفن کیا گیا تو دوسرے روز اس کی لاش قبر سے باہر پڑی ملی، پھر دفن کیا گیا پھر لاش قبر سے باہر پڑی ملی۔ تین مرتبہ دفن کیا گیا اور تینوں مرتبہ زمین نے اسے باہر نکال کر پھینک دیا۔ کیا یہ مرتد لاش باہر نکلنے کے بعد عذاب قبر سے بچ گیا؟ کیونکہ ان کی مزمومہ قبر نے تو اسے باہر پھینک دیا۔ ہرگز نہیں! نہ تو یہ مرتد عذاب قبر سے بچا نہ وہ مشرکین بچ سکتے ہیں جن کی قبریں سمار کردی جاتی ہیں اور پرانی قبروں کی جگہ نئی قبریں بنادی جاتی ہیں۔ سعودی عرب میں تو ایک قبر میں کئی کئی لاشے دفن کئے جاتے ہیں اور پھر کیمیائی عناصر کے ذریعے لاشوں کو تحلیل کر کے قبرستانوں کو بار بار استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر ان قبروں میں ان لاشوں کو ہی زندہ کر کے عذاب و راحت ہو تا تو یہ قبر کے لاشے کیمیائی عناصر سے تحلیل نہ کئے جاتے۔

الغرض نہ تو قبر سمار ہونے کی وجہ سے کوئی عذاب قبر سے بچ سکتا ہے اور نہ پوسٹ مارٹم وغیرہ کے لیے لاشے باہر نکلنے کی وجہ سے عذاب قبر میں تاخیر و تعطیل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ عذاب و راحت کا مقام برزخ ہے، یہ گڑھا نہیں۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا یہ معاملہ مرنے کے بعد فوراً شروع ہوتا ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔ چنانچہ خواب والی معراج کی جو روایت امام بخاری لائے ہیں اس میں مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگ عذاب میں مبتلا دکھائے گئے اور ان کو بتایا گیا کہ:

”فَعَلَّ بِمَالِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ“ یعنی ان کے ساتھ یہ معاملہ قیامت تک ہوتا رہے گا۔ (بخاری)۔

حیرت ہے کہ مسعود احمد صاحب عذاب قبر کی بحث میں اس حدیث کو نہیں لائے۔ وہ نبی علیہ السلام کے خواب کو دینی تو یقیناً سمجھتے ہوں گے لیکن شاید ان کو یہ اندازہ بھی ہو گا کہ یہ روایت ان کے ارضی قبر کے عقیدے کے صریحاً خلاف ہے۔ بہر حال، درج بالا واقعات و مشاہدات سے بھی اس باطل عقیدے کی صریح طور سے تردید ہو جاتی ہے۔

دراصل ان مدعیان حیات فی القبر کے لیے ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ قرآن نے تو دو ٹوک انداز میں دو موتوں اور دو زندگیوں کو ثابت کر دیا ہے، لہذا یہ تیسری زندگی تو صریحاً خلاف قرآن ہے۔ ان کے اکابرین تو اس مسئلہ کو مختلف انداز میں گھماتے رہے ہیں لیکن نام نہاد جماعت المسلمین کے مسعود احمد صاحب نے ایک عجیب ہی حماقت آمیز موقف اختیار کیا ہے۔ اپنی محولہ تفسیر کے صفحہ ۶۶، ۶۷ پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دوسری زندگی یہ ارضی قبر کی زندگی ہی ہے نہ کہ قیامت کے دن کی، چنانچہ (ان کے بقول) روح کو لاشے

میں ڈال کر پھر نکالا نہیں جاتا۔ بالفاظ دیگر روز قیامت مردے کو زندہ کر کے نہ اٹھایا جائے گا بلکہ پہلے سے زندہ کو ہی اٹھا کر نکالا جائے گا!! چہ خوب! ملاحظہ فرمائیے۔ انہوں نے مردہ لاشے کو زندہ کر کے بزم خویش اپنے آپ کو دو موتوں اور دو زندگیوں کے قرآنی نظریے کی تردید کے الزام سے تو بچالیا لیکن یہ نہ سوچا کہ اس منطکہ خیز انداز کو اختیار کر کے قرآن کی کتنی آیات اور کتنی صحیح احادیث کو بہ یک جنبش قلم رو کر ڈالا! یا حسرة علی العباد! افسوس صد افسوس! یہ نفس پرست مقلدین اپنے ”بیوں“ کے وقار کے دفاع کی غلامانہ وجاہات کو شش میں کتاب اللہ کی آیات کے تسخر سے بھی باز نہیں رہتے اور اس دھن میں ان کو اپنے نادان پیرو کاروں پر اپنے علمی تقاضا کا زعم رب ذوالجلال کی پکڑ سے بھی بے خوف رکھتا ہے۔

یہ اپنے باطل نظریے کے دفاع میں ارضی قبر میں مردے کو پیشہ کے لیے زندہ کر کے قرآن کی کتنی آیات کے کفر کے مرکب ہو گئے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ ”اسوات المړاحیاء“ (یہ مردہ ہیں زندہ نہیں۔ ۱ ص ۴۱)

یعنی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ (لوگ جن کو حاجت روائی کے لیے پکار رہے ہیں) نبی ولی وغیرہ) یہ مردہ ہیں زندہ نہیں لیکن اس کے برعکس ان کا کہنا ہے کہ ”یہ زندہ ہیں مردہ نہیں“ (یعنی ان کے بیوں کی بات سچی اور اللہ کی بات غلط! معاذ اللہ!)

۲۔ ”انانحن نحی الموتی۔۔“ (بے شک ہم مردوں کو زندہ کریں گے۔ ص ۴۱)

یعنی اللہ تعالیٰ کا فرمان تو یہ ہے کہ (یہ مردے قیامت تک مردے رہیں گے) پھر روز قیامت) ہم ان مردوں کو ہی زندہ کریں گے لیکن اس کے برخلاف ان کا اصرار ہے کہ یہ زندہ ہیں اور زندہ ہی رہیں گے! (گویا کہ اللہ تعالیٰ سے غلطی ہو گئی ہے جس کی ان کے بزرگوں نے تصحیح فرمادی ہے! العیاذ باللہ!!)

۳۔ ”انہ نجعل الارض کفانا احياء واسواتا“

کیا ہم نے مردوں اور زندوں کو سیٹھنے کے لیے زمین کو کافی نہیں بنایا ہے؟ (الرملا ص ۴۱)

اللہ تعالیٰ نے تو مردوں اور زندوں دونوں کا ذکر فرمایا ہے لیکن ان کے عقیدے کے مطابق سب ہی زندہ ہیں (ہر مردے والا چند لمحوں بعد ہی زندہ ہو جاتا ہے) کچھ زمین کے اوپر ہیں تو کچھ زمین کے اندر!۔ ملاحظہ فرمائیے کیسا تضاد ہے رب ذوالجلال کے فرمان اور ان نفس پرست مقلدین کے موقف میں! اختصار کو مد نظر رکھتے ہوئے یہاں چند آیات ہی پیش کی گئی ہیں مزید کچھ آیات کے حوالے دئے جاتے ہیں جن میں موت اور زندگی دونوں ہی کا ذکر ہے:

الانعام ۳۶، الاعراف ۵۷، الحج ۶، الروم ۵۵، یسین ۷۸، ۷۹، فصلت ۳۹، الشوریٰ ۹، الاحقاف ۳۳، القیامہ ۳۰۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ خود مسعود احمد صاحب اپنی تفسیر کی اسی جلد کے صفحہ ۶۶۶ پر سورۃ العادیات کی آیت نمبر ۹ کا ترجمہ اس طرح فرماتے ہیں:

”تو کیا اسے نہیں معلوم کہ قبروں میں جو (مردے دفن) ہیں جب انھیں (زندہ کر کے) باہر نکالا جائے گا“

ملاحظہ ہو! یہاں قبر والے کو زندہ کر کے اٹھایا جا رہا ہے۔ اب اگر وہ زندہ ہی ہے، مردہ نہیں تو پھر ”زندہ کر کے“ اٹھانا چہ معنی وارد!۔ سوتے کو جگا کر اٹھایا جاتا ہے، جاگتے ہوئے کو تو کوئی نہیں جگاتا! طرا ”یا محاورے کے طور پر اس طرح کہہ دینے کی بات اور ہے اس کو دلیل نہیں بنایا جاتا۔ موصوف کے درج بالا ترجمے نے یہ ثابت کر دیا کہ مردہ کا قیامت تک قبر میں مردہ رہنا اور قیامت کے دن زندہ کر کے اٹھایا جانا ان کے لاشعور میں موجود ہے جس کا اظہار ان سے لاشعوری طور پر ہو گیا ہے۔ کبھی کبھی حقیقت نفس الامر کے صریحاً انکار کرنے والے بھی نادانستہ اور لاشعوری طور پر اعتراف حق کا اظہار کر جاتے ہیں۔ اس کی ایک اور مثال ان کی اسی تحریر سے پیش کی جائے گی۔ مذکورہ تفسیر

میں موصوف نے ارضی قبر میں حیات ثابت کرنے کے لیے منکر روایات دلائل کے طور پر پیش کر کے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ گویا انہوں نے اپنا موقف کماحقہ ثابت کر دیا ہے اور اب یہ اس سلسلہ میں اٹھائے گئے اعتراضات و اشکالات بھی رفع کریں گے!۔ اشکالات تو کیا رفع کرتے! البتہ حیات فی القبر کے خلاف دلائل و اعتراضات کو اشکالات کا روپ دے کر اپنے دُعم میں ان کے جوابات دیتے ہوئے موصوف نے خلاف قرآن باطل موقف کو حق ثابت کرنے کی کوشش میں جو لفاظی فرمائی ہے وہ تو انہی کا حصہ ہے، لیکن کہیں کہیں کچھ سچی بات کہنے پر بھی مجبور ہو گئے ہیں۔ قبر کی کشادگی کے مسئلہ پر لا جواب ہو کر کس طرح جان چھڑانے کی کوشش کی ہے ملاحظہ ہو:

”یہ سوال محض عقل کی بنیاد پر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو ہر طرح قدرت ہے وہ اتنی سی قبر میں بھی گنجائش پیدا کر سکتا ہے اگرچہ ہماری آنکھیں اس کو نہ دیکھ سکیں۔ ہم اس وجہ سے نہیں دیکھ سکتے کہ مرنے کے بعد کے حالات اور ہمارے درمیان ایک پردہ ہے۔ اسی پردہ کو برزخ کہتے ہیں۔“ (تیسرے ص ۶۳)

یہ بات قابل غور ہے کہ تمام قبر پرست اپنے نام نہاد ولیوں (زندہ ہوں یا مردہ) کی مافوق الفطرت کرامات کے لیے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ہی حوالہ دیا کرتے ہیں!۔ برزخ اب اصل مسئلہ پر توجہ کی جائے۔ یہاں موصوف اس بات کو تسلیم کر رہے ہیں کہ ”مرنے کے بعد کے حالات اور ہمارے درمیان ایک پردہ ہے۔ اسی پردہ کو برزخ کہتے ہیں۔“ یہ انہوں نے بالکل صحیح بات کہہ دی ہے اور اس کا مطلب صاف ہے کہ مرنے کے بعد کے حالات (یعنی عذاب و راحت) اس پردہ کے پیچھے ہیں جس کو برزخ کہتے ہیں۔ پردہ کے پیچھے اس مقام عذاب و راحت کو ہی ”عالم برزخ“ کہا گیا ہے۔ اس طرح موصوف نے تسلیم کر لیا کہ عذاب و راحت کا مقام (پردہ کے پیچھے) عالم برزخ ہے نہ کہ یہ ارضی گڑھا اور اس عالم برزخ کا اس لاشے سے کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ ہمارے اور اس ارضی قبر یا اس لاشے کے درمیان تو کوئی پردہ ہے ہی نہیں، بالفاظ دیگر ارضی قبر اور لاشہ ”پردہ“ کے اس طرف ہے اور مرنے کے بعد کے حالات (عذاب و راحت) پردہ کے اس طرف یعنی برزخ میں ہیں اور پردہ کے اس طرف اور اس طرف کے حالات و معاملات کا باہم تعلق قیامت تک کے لیے منقطع ہے۔ اس طرح نہایت ہی آسان انداز سے یہ ثابت ہو گیا کہ موصوف نے درج بالا اقتباس میں لاشعوری طور پر عذاب و راحت کا مقام ”عالم برزخ“ تسلیم کر لیا ہے! اب یہ ان کو اختیار ہے کہ اس کو شعوری طور سے مانیں یا اپنی مانی ہوئی بات کو خود ہی رد کر دیں!۔ یہ تو تھا موصوف کا پہلا اشکال اور اس کے جواب کا انداز۔ دوسرا اشکال ملاحظہ ہو:

”کسی شخص کو شیر نے کھالیا تو اس کی ارضی قبر کہاں بنی کہ اس میں عذاب ہو؟“ (تیسرے ص ۶۳)

سوچنے کی بات ہے کہ اس گڑھے میں گلے سڑے لاشے کو زندہ ثابت کرنے کی کوشش کرنے والے کے پاس اس کا کیا جواب ہو سکتا ہے! چنانچہ لا جواب ہو کر سوال کو ”لغو“ قرار دے دیا۔ اس اشکال کا سیدھا سا دھاب جواب یہ تھا کہ اس شخص کو شیر کے کھانے سے اس کی موت واقع ہو گئی، روح کو عالم برزخ میں جسم دیا گیا اور موت کے بعد سب معاملہ (عذاب و راحت کا) ”پردہ کے پیچھے“ یعنی عالم برزخ میں وقوع پذیر ہوا ہے، شیر کے پیٹ میں نہیں!!۔ پردہ کے پیچھے عذاب و راحت کو تسلیم کرتے ہوئے بھی شعوری طور سے اعتراف حق کے لیے ہمت و جرات کا فقدان ہے! یہ اکابر پرستی کا ہی تو شاخسانہ ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اشکال کو لغو قرار دینے کے بعد تو اصولاً ”اس پر مزید گفتگو نہ ہونا چاہیے“ لیکن ضمیر نے شاید جھنجھوڑا ہے تو بعد کے صفحات میں متعدد بار اس کی وضاحت کی ناکام کوشش بھی فرماتے رہے ہیں۔

اب تیسرا اشکال ان کے لیے اور بھی زیادہ پریشانی کا سبب بن رہا ہے، غور فرمائیے!

”اگر قبر میں اسی جسم کے ساتھ زندہ کیا جائے گا تو زندگیاں تین ہو جائیں گی ایک دنیا کی، ایک قبر کی اور ایک

آخرت کی۔ حالانکہ قرآن مجید میں صرف دو زندگیوں کا ذکر ہے“ (تیسرا ص ۶۴)

اس اشکال کا جواب دیتے ہوئے دو موتوں اور دو زندگیوں کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں اور تیسری زندگی کا انکار کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”... لہذا تیسری زندگی بھی کوئی نہیں۔ حقیقی موت کے بعد جو زندگی شروع ہوتی ہے وہ آخرت ہی کی زندگی

ہے“ (تیسری مرتبہ)

یہاں اگر بری طرح پھنس گئے ہیں قبر میں پڑے ہوئے لاش کو قیامت تک کے لیے مردہ ماننے کو تیار نہیں!! ان کے اس موقف پر بھی بچے تفصیلی بحث ہو چکی ہے دراصل انسانیت اور ہٹ دھرمی کی دلیل میں پھنس کر اب ان کی وہی کیفیت ہے کہ

نہ جائے رفعت نہ پائے مآمن

کیا انہوں نے روز قیامت ”خلق جدید“ کا انکار کر کے اپنے آپ کو ان لوگوں کی قبرست میں شامل تو نہیں کر لیا جن کے لیے فرمایا گیا تھا:

○ ”ہل ہم فی لبس من خلق جلیلہ“ (۱۵۳)

مگر (قیامت کے دن) ایک نئی تخلیق کی طرف سے یہ لوگ شک میں پڑے ہوئے ہیں۔

یعنی یہ اپنے اکابرین کے اندھے مقلدین قیامت کے دن دوبارہ خلق کئے جانے کے بارے میں شک میں پڑے ہوئے ہیں۔

۸۔ منکر روایات کے ذریعہ استدلال: مسعود احمد صاحب نے روح لوٹانے کی دلیل میں کچھ روایات پیش کی ہیں جن میں روح لوٹانے کا ذکر ہے ”ان میں سے ایک ابوداؤد کی روایت ہے جو دراصل خود ان کے عقیدہ کے بھی خلاف ہے۔ شاید موصوف نے اسے غور سے نہیں پڑھا ورنہ وہ اسے پیش نہ کرتے۔ اس روایت میں مومن کے جسم میں روح لوٹانے کا کوئی ذکر نہیں البتہ کافر کے جسم میں دو مرتبہ روح لوٹانے کا تذکرہ ہے ”ایک مرتبہ سوال و جواب سے قبل اور دوسری مرتبہ اس وقت جبکہ فرشتہ کے لوہے کی سلاخ مارنے سے وہ مٹی ہو جاتا ہے“ تو اس کی روح جسم میں پھر لوٹا دی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس روایت سے قبر میں ایک مرتبہ روح نکالنے اور پھر دوسری مرتبہ روح ڈالنے کا اثبات ہوتا ہے یعنی مجموعی طور سے کم از کم ”تین زندگیاں اور تین موتوں“ کا اثبات ہو گیا۔ اب اس روایت کو بطور دلیل پیش کرنے کے بعد ان کا دو موتوں اور دو زندگیاں کو ماننے کا دعویٰ تو خود ان ہی کی دلیل سے باطل ثابت ہو گیا ”فاعتبروا ہا اولی الابصار!۔ ایسے ہی متن کی روایت مسند احمد کے حوالے سے بھی پیش کی گئی ہے جس کی سند تو وہی ہے لیکن متن میں اختلاف ہے۔ اس میں دو مرتبہ روح لوٹانے کا تذکرہ تو نہیں ہے لیکن روح کے مٹی سے پیدا ہونے کا اثبات کیا گیا ہے“ ملاحظہ ہو۔

.... ”لَقَوْلِ اللَّهِ عز وجل اكتبوا کتاب عبدی لی علین واعبدوا الی الارض فانی منها خلقتهم ولیہا اعیدہم

ومنہا اخرجہم ثلثۃ اخری... (پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے کی کتاب کو عیسیٰ (کے دفتر) میں لکھ دو اور

اس کو زمین کی طرف لوٹا دو یقیناً“ میں نے ان کو اسی سے پیدا کیا ہے اور میں ان کو اسی (زمین) میں لوٹاؤں گا اور اسی

(زمین) سے ان کو دوسری بار اٹھاؤں گا) (تیسری مرتبہ)

یہ روایت بتاتی ہے کہ فرشتے اپنے ساتھ روح کو ہی لے کر جاتے ہیں اور پھر اسی کو واپس کیا جاتا ہے اور اسی روح کے مٹی سے پیدا کرنے کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ یہ بات نص قطعی کے صریحاً خلاف ہے۔ جسم کا مٹی سے ہونا اور مٹی ہو کر مٹی میں مل جانا تو قرآن و حدیث سے ثابت ہے لیکن روح تو ”من امر ربی“ ہے اس کے مٹی سے پیدا ہونے اور مرنے کے بعد مٹی میں مل جانے کی قرآن یا صحیح حدیث میں کوئی دلیل نہیں بلکہ قرآن تو بتاتا ہے:

لنمسک الہی قضی علیہا الموت... (الزمر)

(اور جس کے لیے موت کا فیصلہ ہو گیا ہو اس کی روح کو اللہ تعالیٰ روک لیتا ہے)

ملاحظہ فرمایا ”قرآن حکیم“ تو فرماتا ہے کہ مرنے والے کی روح کو (قیامت تک کے لیے) روک لیا جاتا ہے لیکن یہ روایت ثابت کرتی ہے اسے مٹی میں ملا دیا جاتا ہے! غور فرمائیے! کیسی منکر اور خلاف قرآن روایات کو عقیدہ کی بنیاد بنایا گیا ہے۔ ظاہر ہے مسلک پرستی کا حق اس

کے بغیر ادا ہو بھی نہیں سکتا۔ اس روایت کی سند پر نظر ڈالیں تو معلوم ہو گا کہ اس کے دو راویوں زاذان ابو عمرو الکلبی اور منہال بن عمرو پر کتب اسامہ الرجال میں شدید جرح موجود ہے (ملاحظہ فرمائیں مثل اللہ شمارہ ۳۳ اور ایمان خالص دوئم ص ۱۵)۔ ذہبی نے (سیر اعلام النبلاء جلد ۵ ص ۱۸۳) صراحت کے ساتھ اس روایت پر جرح کی ہے:

○ قلت حديثه في شأن القبر بطوله فيه غرابة ورواه عن زاذان عن البراء (میں کہتا ہوں کہ اس کی قبر کے بارے میں جو طویل حدیث ہے وہ منکر اور غریب ہے جو کہ یہ زاذان اور وہ براء سے روایت کرتا ہے)

کیا یہ روایت اس قابل ہے کہ اس کو دلیل کے طور پر پیش کیا جائے؟ سچ ہے، آخرت کی جواب دہی سے بے خوف انسان باطل موقف کو ثابت کرنے کے لیے کس طرح ہاتھ پاؤں مارتا ہے، اس کی یہ بین مثال ہے۔ اس کے علاوہ اس تفسیر میں ابن ماجہ کی بھی دو روایات پیش کی گئی ہیں، سند دونوں کی ایک ہی ہے لیکن متن میں کافی فرق ہے۔ جسم میں روح لوٹانے کا ان دونوں میں تذکرہ نہیں ہے۔ اس سند کے دو راویوں ابو بکر ابن ابی شیبہ اور شبابہ پر محدثین نے اعتراضات کئے ہیں۔ جب راویوں کے حافظے کا یہ عالم ہو کہ وہ کبھی روایت کو کسی طرح بیان کرتے ہوں اور کبھی کسی طرح تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ایسی روایتوں کو قرآن کی محکم آیات کے مقابلہ میں لانا کیسی جمالت اور ہٹ دھرمی ہے! مزید ملاحظہ ہو۔ موصوف نے اپنے کتابچے ”عذاب قبر کہاں ہوتا ہے“ میں اعادہ روح کی روایت کی دو اور اسناد بھی پیش کی ہیں ایک اہل حدیث عاصم بن عبد اللہ القروی کی کتاب ”اثبات اعادہ روح“ کے حوالے سے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ دونوں اسناد ابو داؤد اور سند احمد کی سند سے بھی زیادہ ضعیف ہیں۔ ایک سند اس طرح ہے: اخبرنا محمد بن يعقوب بن يوسف حدثنا محمد بن اسحاق الصغار البانائي النضر بن القاسم حدثنا عيسى بن المسيب عن عدي بن ثابت عن البراء۔ ان پر جرح ملاحظہ ہو:

عيسى بن المسيب الكوفي: يحيى بن معين 'نسائي' اور دار قطنی کہتے ہیں کہ یہ ضعیف ہے۔ ابو حاتم اور ابو زرہ کہتے ہیں کہ یہ قوی نہیں ہے۔ ابن حبان وغیرہ نے بھی ان پر کلام کیا ہے۔ ابو داؤد کہتے ہیں کہ وہ کوفہ کا قاضی تھا، ضعیف ہے (میزان الاعتدال جلد ۳ ص ۲۲۲)۔

عدي بن ثابت: یہ نہ صرف غالی شیعوں تھے بلکہ شیعوں کے ذاکر اور ان کی مسجد کے امام بھی تھے۔ دوسری سند اس طرح ہے: محمد بن سلمہ عن خصيف عن مجاهد عن البراء ان پر جرح ملاحظہ ہو:

خصيف بن عبد الرحمن الجعزي: ان کے بارے میں مختلف رائیں پائی جاتی ہیں۔ بعض تو انھیں ثقہ اور "لا بأس به" قرار دیتے ہیں لیکن اکثر محدثین ان کو ضعیف قرار دیتے ہیں۔ بہر حال، ایسے راوی سے کوئی روایت بطور حجت پیش نہیں کی جاسکتی۔ ابو حاتم ان کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ صالح ہیں، غلطیاں بھی کافی کرتے ہیں۔ ان کے خراب حافظے پر اعتراض کیا جاتا ہے۔ نسائی نے کہا کہ عتاب اور ضیعت دونوں قوی نہیں ہیں۔ ایک مرتبہ صالح کہا۔ علی بن مدینی کہتے ہیں کہ "یحيى بن سعيد اسے ضعیف قرار دیتے تھے۔ جریر کہتے ہیں کہ یہ مرتبی تھا۔ ابن معین کہتے ہیں کہ ہم اس کی احادیث سے بچا کرتے تھے۔ ابن خزیمہ کہتے ہیں کہ یہ حجت نہیں ہے۔ ابو احمد الحاکم کہتے ہیں کہ یہ قوی نہیں ہے۔ ازدی کہتے ہیں کہ یہ کچھ نہیں ہے۔ ابن حبان کہتے ہیں کہ ہمارے آئمہ کی ایک جماعت نے انھیں ترک کر دیا ہے البتہ بعد والوں نے ان سے حجت لی ہے یہ اچھے آدمی تھے لیکن اپنی روایات میں غلطیاں بہت کرتے تھے۔ احمد بن حنبل نے بھی کہا ہے کہ یہ حدیث کے معاملے میں قوی اور حجت نہیں ہے۔ (تذیب استنبیج جلد ۳ ص ۱۲۳ اور میزان الاعتدال جلد اول ص ۶۵۴) اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کس طرح بے حیثیت اور منکر روایات کو باطل موقف کی تائید کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

۹۔ آیات قرآنی کا بے محل استعمال: مسعود احمد صاحب نے منکر روایات کو استدلال کی بنیاد بنانے کے بعد آیات قرآنی سے کس

طرح اپنے مطلب کا مفہوم اخذ کرنے کی کوشش کی ہے اب اس کا بھی ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔ موصوف نے مذکورہ تفسیر کے صفحہ ۶۶۵ تا ۶۶۹ پر جو آیات پیش کی ہیں ان سے تو صرف دو باتوں ہی کا اثبات ہوتا ہے "یعنی مرنے کے فوراً" بعد عذاب قبر واقع ہونا (سورۃ المؤمن۔ ۳۵ تا ۳۶ سورۃ الانعام۔ ۹۳) اور انسانی جسم کا مٹی سے بننا مرنے کے بعد مٹی میں مل جانا اور پھر قیامت کے روز اسی مٹی سے (زندہ کر کے) اٹھایا جانا (سورۃ المدثر۔ ۵۵ تا ۵۷ سورۃ النازعات۔ ۲۵) اور یہ معاملہ سب ہی کے ساتھ ہوتا ہے خواہ کوئی ارضی گڑھے میں دفن ہو کر گئے "سزے" کھڑے مکوڑوں کی غذا بن کر مٹی میں ملے یا بحور کے جانوروں کی غذا بن کر یا آگ کی چٹا میں بھسم ہو کر "انجام کار جسد خاکی کے اجزاء اسی زمین کی مٹی ہی میں مل جاتے ہیں۔ انسانوں اور جانوروں کے اجزاء عصری کا مستقر ہر حال زمین ہی ہے کوئی اور جگہ نہیں۔ پھر روز قیامت انسان اسی زمین سے اٹھائے جائیں گے" یہ ایک ایسی مسئلہ اور غیر متنازعہ حقیقت ہے جس سے شاید ہی کوئی انکار کرے "اس کو ثابت کرنے کے لیے صفحات کے صفحات بحرینا کہاں کی دانشمندی ہے!۔ لیکن موصوف کا کارنامہ تو یہ ہے کہ اس مسئلے کو جگہ۔ جگہ دہرایا ہے اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کر دکھانے کی کوشش کی ہے کہ عذاب اسی ارضی قبر میں ہو رہا ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک قبر کے معنی "ارضی قبر" ہی ہے خواہ مردے کو جلا دیا جائے یا وہ جانور کی غذا بن جائے اور اس کی ارضی قبر کا کوئی وجود ہی نہ ہو (مثال کے طور پر غرق شدہ قوم نوح)۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا "قیامت کے دن انسان اسی زمین سے اٹھا کھڑے کئے جائیں گے قطع نظر اس کے کہ ان کے اجزاء جسمانی دور دور منتشر ہو چکے ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے علم و قدرت سے کوئی چیز یا ہر نہیں فرمایا:

○ قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْأَرْضُ مِنْهُمْ وَعَدَلْنَا كِتَابَ حَقِيقَتِهِ (۳)

(جو کچھ زمین (ان کے جسم میں سے) کم کرتی ہے وہ ہمارے علم میں ہے۔ ہمارے پاس حفاظت کرنے والی کتاب ہے)

بخاری کی درج بالا روایت میں طریقہ کار کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے کہ "عجب الذنب" پر انسان کو بنا دیا جائیگا۔ اس اصول کی پیش نظر۔

○ أَفَأَمَّا الْفُتُورُ (قبر والوں کو زندہ کر کے باہر نکالا جائے گا) یا

○ وَأَمَّا الْقُورُ (جب قبروں کو اکھاڑ دیا جائے گا)

میں جن قبروں کا ذکر ہے وہ محض یہ چند قبریں نہیں جو آج قبرستان کی شکل میں ہمارے سامنے ہیں بلکہ وہ تمام قبور مراد ہیں جو شروع سے بنی اور مسمار ہوتی رہی ہیں۔ اور فی الحقیقت زمین کے چپے چپے پر قبر ہے "اور قیامت تک تو ایک ایک قبر کی زمین میں بلا ہالہ ہزاروں لاکھوں ہی دفن ہو چکے ہوں گے" نہ صرف لاشوں کی شکل میں بلکہ کھائے اور جلائے ہوئے جسمانی اجزاء اور ذرات کی شکل میں۔ قرآن و حدیث سے یہ بالکل واضح ہے کہ قیامت کے دن تو بلاشبہ ہر شخص اپنی ارضی قبر سے اٹھے گا (وہ مقام جہاں عجب الذنب پر اٹھا کھڑا کیا جائے گا) لیکن اس قبر کو آج کی یہ ارضی قبر قرار دے کر سوال و جواب اور عذاب و راحت کا مقام تصور کرنا سراسر نادانی اور جہالت ہے کیونکہ اس کے لیے تو اسی لاشے میں روح لوٹانا ناگزیر ہے جو صریحاً "خلاف قرآن و حدیث ہے۔ اس کے مفصل دلائل اوپر دئے جا چکے ہیں اور واضح کر دیا گیا ہے کہ روح کو دنیاوی جسم میں قیامت سے پہلے نہیں لوٹایا جائے گا۔ مردوں کو قیامت کے دن زندہ کر کے ارضی قبر سے اٹھایا جانا تو قرآن و حدیث سے بالکل ثابت اور ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے لیکن سوال و جواب اور عذاب و راحت کا مقام یہ لگا ہوں کے سامنے والی ارضی قبر نہیں بلکہ پردہ کے پیچھے عالم برزخ ہے۔ یہ قرآن و حدیث کا اٹل فیصلہ ہے اور کسی حد تک موصوف بھی اس کو تسلیم کر چکے ہیں۔

۱۰۔ مسعود احمد صاحب کے عقائد و نظریات پر ایک نظر: اب جبکہ مسعود احمد صاحب کا ذکر چل رہا ہے تو مناسب اور بر محل ہو گا کہ ان کے کچھ اور عقائد و نظریات بھی ان کی اپنی کتابوں کے حوالے سے زیر بحث آجائیں تاکہ اتمام حجت ہو جائے:

ع خوشتر آن باشد کہ مرد لہراں - گفت آید در حدیث دیگران

ابتداء ان کے کتابچے ”ذہن پرستی“ سے کی جاتی ہے۔ موصوف بھی بریلوی دیوبندی اور دیگر فرقہ پرستوں کی طرح سماع موتی کے قائل ہیں (اور کون نہیں جانتا کہ یہ عقیدہ قبر پرستی کی عمارت کا اہم ستون ہے) لہذا یہاں یہ عقیدے کی پر زور و کالت کرتے نظر آ رہے ہیں۔ قبل اس کے کہ اس پر کچھ تبصرہ ہو، بطور تمہید یہ عرض کر دینا مناسب ہو گا کہ ڈاکٹر عثمانی سے ایک ”قلطی“ سرزد ہو گئی (اور فی الحقیقت بڑی ہی مبارک تھی یہ قلطی!) انہوں نے ان نام نہاد ”مومنین و مسلمین“ اور ان کی قد آور اکابر شخصیات کے چروں سے نقاب ہٹا دی، ان کے عقائد و نظریات کو ان کی اور ان کے معتقدین کی کتابوں کے حوالے سے قرآن و حدیث کے خلاف ثابت کر دکھایا۔ چنانچہ اپنے آپ کو توحید کا علمبردار سمجھنے والوں کے عقائد و نظریات کفر و شرک سے آلودہ پائے گئے۔ دراصل حق کا واضح ہو جانا اللہ کی رحمت تھا اور ان کو دعوت حق کی مومنانہ اعلیٰ طرف سے پذیرائی کرتے ہوئے اصلاح احوال کی طرف توجہ دینا چاہیے تھی، لیکن پیشہ دارانہ اٹانیت اور ”ذہن پرستی“ نے عقل سلیم پر غلبہ کیا اور یہ ضد و ہٹ دھرمی کے ساتھ بغض و عناد کی روش اپنا کر مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے اور ہاتھ دھو کر اس مو مجاہد کے پیچھے پڑ گئے۔ قرآن و حدیث کے خلاف عقائد و نظریات پر جسے رہنے والوں کے پاس دلائل کی تو بنیاد ہی نہیں ہوتی سوائے اس کے کہ ”فخرف القول غرودا“ یعنی خوشنما الفاظ کے ذریعے باطل کو حق ثابت کرنے میں سرگرم ہو جائیں، اس کے کچھ نمونے بطور مشقے از خودارے یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر عثمانی نے اپنے مختصر مگر جامع کتابچے ”یہ مزار یہ میلے“ میں کفر و شرک کے شجر خبیث کی جڑ پر زبردست تیشہ زنی کی ہے اور عقائد کی خرابیوں بالخصوص قبر پرستی کے مختلف پہلوؤں کی قرآن و حدیث کی روشنی میں نشاندہی کی ہے۔ تمام ہی فرقہ پرست قبرستان میں ”السلام علیکم یا اهل القبور“ کہنے کو سماع موتی کی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کتابچے کے ص ۱۹ پر وضاحت کی کہ یہاں سلام سے مردوں کو ستانا مقصود نہیں، کیونکہ مردے تو سننے اور جواب دینے کی صلاحیت سے محروم ہیں، بلکہ یہ تو محض دعا ہے۔ عموماً ہر زبان میں خلوص کے ساتھ ادیبانہ انداز میں دعا کرتے ہوئے مخاطب کا میث استعمال کر لیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے سمجھانے کے لیے اس کی ایک مثال بھی پیش کی۔ موصوف نے اس معقول اور مدلل بات کا جس انداز سے مضحکہ اڑایا ہے وہ ان کی جہالت و کم ظرفی کا منہ بولتا ثبوت ہے، ملاحظہ ہو۔

”جواب مذکور میں خط کشیدہ الفاظ ملاحظہ فرمائیے، کتنا مضحکہ خیز جواب ہے! کیا سلام کرتے وقت یہی جذبہ ہوتا ہے جو اس عبارت میں بیان کیا گیا ہے؟ کیا یہاں نظریہ کی بے جا حمایت کام نہیں کر رہی؟ اگر مردے کو زندہ مان لیا تو بس شرک ہو جائے گا یا یہ کہ مردے نے اگر کسی وقت بھی کچھ سن لیا تو توحید خاک میں مل جائے گی، حالانکہ یہ بالکل

فرضی چیزیں ہیں جن پر ذہن تیار کیا گیا ہے۔“ (ذہن پرستی ص ۶۷-۶۸)

ذرا غور فرمائیے! یہ صرف ایک ہی اقتباس موصوف کی ذہن پرستی کی کیسی بھرپور عکاسی کرتا ہے! کیا ایک سنجیدہ اور معقول بات کو ”مضحکہ خیز“ کہنا عدم سنجیدگی اور چھپھورے پن کی انتہا نہیں ہے؟ کوئی معمولی علم و دانش والا بھی ایسی جاہلانہ بات نہ کرے گا۔ موصوف کے نزدیک سلام کرتے وقت ”جذبہ دعا“ نہیں ہوتا، تو کوئی ان سے پوچھے کہ پھر اور کون سا جذبہ ہوتا ہے؟ ”السلام علیکم ورحمتہ اللہ“ کے الفاظ کس جذبہ کے ساتھ ادا کئے جاتے ہیں؟ اب اگر یہ الفاظ کا مقصد و مضمون کچھ بغیر ہی ان کو ادا کریں گے تو مطلوبہ جذبہ کیسے پیدا ہو گا؟ یہ مانیں یا نہ مانیں سلام کے الفاظ تو دعائے ہی ہیں اور سلام کا مقصد مومن بھائیوں کے اندر ایک دوسرے کے لیے محبت، مہربانی اور اخلاص کے جذبات کو پروان چڑھانا ہے۔ ظاہر ہے یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب کہ پورے شعور اور خلوص کے ساتھ ہی ان کو ادا کیا جائے، خواہ سلام زندوں کو کیا جائے یا مردوں کو۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں خلوص نیت اور جذبہ اخلاص پر ہی اجر ملتا ہے۔ موصوف کے مذکورہ اقتباس کی عبارت کے ایک ایک لفظ سے بغض، کینہ اور کھسیانہ پن مترشح ہوتا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ بغیر دلیل بات کرنے

والوں کا یہی لب و لہجہ ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں ”مردے کو زندہ مان لیا تو بس شرک ہو جائے گا۔“ علامہ صاحب! پہلی بات تو یہ ہے کہ (موت کے ڈاکٹری فیصلہ کے بعد) مردے کو زندہ قرار دے کر آپ ہر ایک کی نظر میں ہوش و حواس سے عاری اور عقل و دانش سے محروم سمجھے جائیں گے۔ کیونکہ اپنے چہیتے مردے کو زندہ سمجھتے ہوئے تو کوئی بھی (بشمول آپ کے) گڑھے میں ڈال کر مٹی میں نہ دباے گا! البتہ مردے کو اسی گڑھے میں زندہ ماننے سے مردہ پرستی، قبر پرستی کا دروازہ کھلتا ہے جو شرک کی بدترین شکل ہے۔ اسی لیے مردے کو زندہ سمجھنے کے موقف کی قرآن و حدیث میں سختی سے تردید کی گئی ہے جس کی مفصل بحث اوپر ہو چکی ہے۔

”مذہب برزخ“ میں ص ۱۹ پر عمرو بن عامرؓ سے منسوب ایک وصیت کا ذکر ہے جسے مسلم نے روایت کیا ہے کہ جب وہ سكرات الموت کی حالت میں تھے تو انہوں نے وصیت کی کہ مجھے دفن کرنے کے بعد کچھ دیر قبر پر کھڑے رہنا تاکہ میں تم سے انیئت حاصل کر لوں اور مجھے معلوم رہے کہ فرشتوں کو کیا جواب دوں۔ اس روایت کی سند اور اس کے متن دونوں پر اعتراض کیا گیا ہے (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مذہب برزخ ص ۲۰)۔ حالانکہ قبر میں مردے کا باہر کھڑے ہوئے لوگوں سے انیئت حاصل

کرنا اور سوال و جواب کے لیے کسی قسم کی تعینت پانا نصوص قطعیہ کے صریحاً خلاف اور عملاً ناقابلِ قسم ہے۔ قرآن کا فرمان بھی اوپر ذکر کر دیا گیا ہے کہ مرنے والوں میں تو جان کی رمت بھی باقی نہیں رہتی، دوسرے یہ کہ عالم برزخ سے تو دنیا والوں کا کوئی تعلق ہی باقی نہیں رہتا۔ لیکن موصوف کیونکہ قبر میں دفن ہونے کے بعد قبر میں ہی مردہ لاشے کے زندہ ہو جانے پر عقیدہ رکھتے ہیں، اس لیے اس کے ہر پہلو کا دفاع لازم خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

”الغرض حضرت عمرو بن عامرؓ نے یہ بات اگرچہ سیاق الموت میں کہی تھی لیکن بالکل صحیح بات کہی تھی“ (ابن عربی ص ۱۹۸)۔ اس طرح موصوف نے خلاف قرآن موقف کی تائید کر دی کہ مردہ سستا بھی ہے اور باہر والوں سے مانوس بھی رہتا ہے! کہیں کہیں موصوف باطل موقف کی حمایت میں بریلویوں والے سطحی طرز استدلال پر اتر آتے ہیں ملاحظہ ہو:

ہماری سمجھ سے یہ باہر ہے کہ زندہ کو اگر سب سے مانا جائے تو شرک نہیں ہوتا جیسا کہ ارشاد باری ہے۔

فَيَخْلُقْنَا هَٰئِهِ نَبِيًّا (بصیرا) (مر-۲) ہم نے انسان کو سب سے مانعبر بنایا۔

لیکن اگر مردہ کو سب سے مان لیا جائے تو شرک ہو جائے گا حالانکہ زندہ ہو

یا مردہ محض سب سے ماننے سے شرک لازم نہیں آتا۔ زندہ اور مردہ کی سماعت

مقتید و محدود ہے، اللہ تعالیٰ کی سماعت غیر مقتید اور لامحدود ہے۔ دونوں

میں بین قرق ہے۔ (ابن عربی ص ۱۹۸)

اب کوئی ان کا مقلد ہمت کر کے ان کی توجہ اس طرف دلائے کہ حضرت بریلوی بھی آپ کی ہی طرح استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ”زندہ مدد کرے تو شرک نہیں ہوتا“ مردہ مدد کرے تو کیسے شرک ہو جائے گا؟ بس یہ ذہن میں رہے کہ اللہ کی طاقت لامحدود ہے اور زندہ و مردہ کی طاقت محدود!۔ موصوف شاید قرآن و حدیث اور مشاہدہ انسانی پر مبنی اس نص قطعی اور حقیقت نفس الامری سے ٹالبد تو نہ ہوں گے کہ سماعت و بصارت، حس و ادراک، عقل و دانش اور فکر و تدبیر وغیرہ کا تعلق تو حیات دنیاوی کے ساتھ ہے، موت کے بعد یہ تمام قوتیں سلب ہو جاتی ہیں، پھر بھی مردہ لاشے کے سمیع و بصیر (اعقل و فہم) ہونے پر اصرار استوار جد کی ہٹ و دھری ہے۔ مردے کے اندر ان قوتوں کے تصور سے ہی تو قبر پرستی کے شرک کا دروازہ کھلتا ہے!۔ بریلوی یہ طرز استدلال اختیار کرے تو شرک ہو جاتا لیکن موصوف اپنے کو توحید کا علم بردار سمجھیں تو یہ ان کی خود فریبی ہے۔ اب یہ پورا بھی ملاحظہ ہو کہ موصوف جو خود مشرکانہ عقائد کے مدافعين میں سے ہیں، شرک فی

المشترک پر گفتگو کرتے ہوئے کس طرح حدود سے تجاوز فرما جاتے ہیں اور شرک کے شجر خبیث پر قیشہ زنی کرنے والے پر بھی شرک کا الزام عائد کرنے سے نہیں چوکتے، اس کا بھی ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیں، فرماتے ہیں:

شرک فی التشریع | موصوف نے اپنی کتاب میں کسی کے حق کا واسطہ دے کر دعاء کرنے کو ناجائز بتایا ہے لیکن اس سلسلے میں نہ قرآن مجید کی آیت پیش کی نہ کوئی حدیث نبوی۔ کسی چیز کو حلال یا حرام کرنے کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو ہے لیکن معلوم نہیں موصوف نے یہ اختیار کب سے خود استعمال کرنا شروع کر دیا یا دوسروں کو تفویض کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیز وہ ہے جو قرآن مجید یا حدیث نبوی میں حرام ہے، کسی کے فتوے سے کوئی چیز حرام نہیں ہو سکتی لیکن موصوف نے ”بھئی فلاں“ کہہ کر دعاء مانگنے کو حرام تو کہا لیکن دلیل میں انہوں نے شرح کر فی ہدایہ، صبیانۃ الانسان وغیرہ کے حوالے دئے (یہ قبریں یہ آستانے، ایریشن اول و ثانی ص ۲۲ و ص ۲۳) (یہ مزار یہ میلے ص ۱۸) گویا انہوں نے اس چیز کو کواقوال الرجال کے ذریعہ حرام کیا، تو کیا اقوال الرجال بھی اللہ کے دین میں قابل سند ہیں؟ کیا اللہ تعالیٰ کے علاوہ بھی کوئی شارع ہے؟ افسوس ہے کہ موصوف نے یہاں تو حید کو ملحوظ نہیں رکھا اور شرک کی طرف مائل ہو گئے،

عکس (۱) ان پر حتی ص ۸۴، ۸۵

موصوف کی اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی بات کو جائز و ناجائز ثابت کرنے کے لیے قرآن و حدیث کے دلائل کے ساتھ تائید و تشریح کے طور پر اگر علماء کے اقوال بھی پیش کئے جائیں تو یہ شرک فی التشریع کے مترادف ہو گا کیونکہ دین کا انحصار کسی کی رائے یا ذاتی فتوے پر نہیں۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ڈاکٹر عثمانی کے کتابچے ”یہ مزار یہ میلے“ میں واسطے ویلے کے شرک کے رد میں قرآنی آیات، احادیث صحیحہ اور صحابہ کرام کے عمل کی بنیاد پر جو دلائل پیش کئے گئے ہیں ان سب سے صرف نظر کر کے مسعود احمد صاحب نے کس ڈھٹائی کے ساتھ یہ لکھ دیا ہے کہ ”نہ قرآن مجید کی آیات پیش کی نہ کوئی حدیث نبوی.....“۔ بغض و کینہ پر مبنی علمی خیانت اور ذہن پرستی کی اس سے بدتر مثال اور کیا ہوگی!

موصوف کا دہرا معیار: بہر حال ’فی الحال اس پر مزید بحث کرنا مقصود نہیں‘ یہاں تو صرف ان کو یہ آئینہ دکھانا ہے کہ کچھ ایسی ہی صورت حال میں کیا موصوف اپنے اوپر بھی شرک کا فتویٰ لگانا پسند کریں گے!۔ آئیے ذرا اس کا بھی جائزہ لیں۔ مسعود احمد صاحب کے نزدیک جبری قرأت کے دوران امام کو دو رو سکتے کرنے چاہیں مگر مقتدی بھی ان سکتوں میں سورۃ فاتحہ پڑھ لیں۔ (اس وقت ہم یہ بحث نہیں کرتے کہ یہ سکتے بدعت ہیں) اس کے لیے موصوف نے درج ذیل دلائل پیش کئے ہیں ملاحظہ ہو۔

محدثین اور سکتے | اہل حدیث یعنی اہل علم یعنی محدثین اسی چیز کے قائل ہیں کہ

امام کے سکنات میں سورۃ فاتحہ پڑھی جائے۔

حضرت ابو سلمہ تابعی فرماتے ہیں :-

لما امر مکنتان فاغتصوا الغزاة امام کے دو سکتے ہوتے ہیں۔ ان دونوں

فیہما بفاتحۃ الكتاب وجوز الغزاة میں سورۃ فاتحہ کی قرأت کو لوٹ لیا کرو۔

امام عطا رہا ہی فرماتے ہیں :-

مدرجہ بالا اماموں ہی پر موقوف نہیں تمام
محدثین کا یہی عمل ہے۔ امام ترمذی کہتے ہیں :-

اذا كان الامام يجهر فليبادر

جب امام بلند آواز سے قرأت کرے تو

بقرآنۃ اهل القرآن اولیقرء بعد
ما یسکت فاذا قرء فلیس یسکت
كما قال الله عز وجل (جزء)
القرآنۃ للامام البخاری ملکہ
وسندہ صحیح)

اس کے قرأت شروع کرنے سے پہلے
جلدی سے سورۃ فاتحہ پڑھ لیا کرو یا بعد
میں جب وہ سکت کرے تو پڑھ لیا کرو
لیکن جب وہ قرأت کرے تو خاموش
رہا کرو جیسا کہ اللہ عز وجل نے فرمایا
ہے۔

واختار اصحاب الحدیث ان
لا یقرء الرجل اذا جهر الامام
بالقرآنۃ قالوا یتبع سکتات
الامام (ترمذی کتاب الصلوۃ باب ما جاء
فی ترک القراءة خلف الامام جزء اول
ملکہ)

محدثین نے اختیار کیا ہے کہ جب امام بلند
آواز سے قرأت کرے تو مقتدی کچھ نہ
پڑھے۔ محدثین کہتے ہیں کہ امام کے سکتات
کی متابعت کرے (یعنی امام کے سکتات
میں پڑھے)۔

امام بخاری تحریر فرماتے ہیں :-

نقول یقرء خلف الامام عند
السکات (جزء القراءة للبخاری ملکہ)

ہم کہتے ہیں کہ مقتدی امام کے سکتات
میں پڑھے۔

الغرض تمام المحدثین یعنی تمام اہل علم یا محدثین امام کے سکتات کو صحیح مانتے
ہیں لیکن آج کل کے لوگ جو بے علم ہوئے ہوئے بھی المحدثین کہلاتے ہیں وہ کہتے ہیں
امام کے سکتات کا ثبوت نہیں لہذا نہ امام دوسکتے کرے اور نہ مقتدی سکتوں میں
پڑھے۔ اب بتائیے اہل علم کی بات مانی جائے یا بے علم لوگوں کی۔

عکس "امام کے دوسکتے" ص ۱۱۰-۱۱۱-۱۱۲

ملاحظہ فرمایا کہ کس طرح آئمہ کے اقوال کو اپنے مسلک کی مداخلت کے لیے بطور سند و حجت پیش کیا جا رہا ہے۔ کیا اب موصوف خود اپنے
جاری کردہ شرک فی التشریع کے فتوے کی زد سے بچ سکتے ہیں؟ کیونکہ درج بالا اقتباس میں جوش بیانی میں خود ہی کہہ گئے ہیں :-
"تو کیا اقوال الرجال بھی اللہ کے دین میں قابل سند ہیں؟ کیا اللہ تعالیٰ کے علاوہ بھی کوئی شارع ہے؟ افسوس ہے
کہ موصوف نے یہاں توحید کو ملحوظ نہیں رکھا اور شرک کی طرف مائل ہو گئے۔" (ذہن پرستی ص ۸۲)
کیا اپنے مسلک کی تائید میں اقوال الرجال پیش کرنے کے بعد موصوف شرک کی طرف نہیں مائل ہو گئے؟ کیا موصوف اس ماہرانہ طریقہ
کار پر عمل پیرا تو نہیں جس میں اصولوں کا اطلاق صرف دوسروں پر تنقید کے لیے ہی ہوتا ہے اور خود ان سے بے نیاز رہتے ہیں؟ اگر یہ بات
ہے تو یہ آخرت کی جواب دہی سے بے غوفی کی علامت ہے اللہ نہاہ میں رکھے۔ موصوف کے اپنے قیمتی مشورے کے مطابق

تردید کر کے کسی دوسرے شرک پر انہیں قائم رکھا جائے بلکہ اس شرکیہ فعل کو
دلیل میں پیش کر کے اس شرک کی جڑیں اور مضبوطی جائیں۔ توحید یہ
ہے کہ بس اللہ تعالیٰ کے فرمان سے (جو فرمایا مجید اور حدیث نبوی میں
مذکور ہو) حلال و حرام کا فیصلہ کیا جائے، نہ اپنے ذہن سے فیصلہ کیا جائے
اور نہ دوسروں کی رائے سے، لیکن موصوف نے اپنی کتاب میں ذہن سے
فیصلہ کیا ہے یا دوسروں کی رائے سے۔ کیا آئندہ آنے والی تسلیں موصوف
کی عبارتیں پیش کر کے موصوف کی طرف شرک کو منسوب نہیں کریں گی؟

ہونا یہ چاہیے تھا کہ موصوف ان
کو قرآن مجید اور حدیث شریف کے دلائل دے کر خاموش ہو جاتے اور
انہیں یہ یقین دلائے کہ دین میں سند صرف اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے یا اس
کے رسول کی حدیث ہے، اسی پر ان کے ایمان کو استوار کرنے، توحید فی
الدین اور توحید فی التشریع کی دعوت دے کر شرک فی الدین اور شرک فی
التشریع کی تردید کرنے، توحید پھیلانے کا یہ طریقہ تو صحیح نہیں کہ کسی شرک کی

عکس "ذہن پرستی ص ۸۲"

درج بالا اقتباسات یہ ثابت کر دینے کے لیے کافی ہیں کہ موصوف کس قدر قول و فعل کے تضاد کا شکار ہیں اور یہ ان کا انفرادی طرز
عمل نہیں بلکہ جماعتی اور تنظیمی طریقہ کار معلوم ہوتا ہے۔ ان کی جماعت کے ایک ذمہ دار فرد "شداد کوٹ" کے ناظم عبد الحمید صاحب نے

کتنے ہی اکابر اسلاف اور فرقہ پرستوں کے فتاوے اور اقوال اپنے موقف کی تائید میں بطور دلیل پیش کئے ہیں۔ تو کیا موصوف کے معیار اور اصول کے مطابق یہ شرک فی التشریح کے مرتکب نہ ہوئے؟

فہرست

مذہب اہل حدیث کی کتابوں سے جماعت المسلمین کے حق پر ہونے کا ثبوت
دوبندی عقیدہ رکھنے والوں کی کتابوں سے جماعت المسلمین کا ثبوت
جماعت اسلامی کی کتابوں سے جماعت المسلمین کا ثبوت
بریلوی عقیدہ رکھنے والوں کی کتابوں سے جماعت المسلمین کا ثبوت
شیعہ مذہب کی کتابوں جماعت المسلمین کا ثبوت

جماعت المسلمین ہی برحق ہے

اہل سنت۔ اہل حدیث اور اہل تشیع کے مشترک طہارہ کی شہادت

مبارک

مترجم: مفتی محمد امجد علی
محقق: مولانا محمد امجد علی

جماعت المسلمین

اب کوئی ان سے پرچھے کہ ابجد، شول، دیوبندیوں، بریلویوں اور شیعوں کے اقوال ان کی جماعت کی نظر میں حجت ہیں جن کو دلیل کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے کیا یہ اقوال الرجال پیش کر کے شرک فی التشریح کے مرتکب نہیں ہوئے؟ ان کے قول و فعل کے تضاد اور دہرے معیار (اپنے لئے کچھ اور دوسروں پر تنقید کے لیے کچھ اور) کے بارے میں بھی موصوف کی تحریروں سے بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ درج بالا سطور میں مذکورہ تفسیر میں عذاب قبر پر کچھ احادیث لائے ہیں ان میں سے عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی ایک روایت کو بڑی ہوشیاری سے تجزیہ انداز میں پیش کیا ہے۔

(۳) حضرت عائشہ صدیقہ طاہرہ مطہرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں:-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک یہودی عورت (کی قبر) کے پاس سے گزرے۔ اس پر اس کے گھروالے رو رہے تھے تو آپ نے فرمایا کہ یہ لوگ اس پر رو رہے ہیں اور اس پر اس کی قبر میں عذاب ہو رہا ہے۔

(عکس تفسیر ص ۴۳)

إِنَّمَا مَرَّ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى يَهُودِيَّةٍ (وَفِي رِوَايَةِ النَّسَائِيِّ بِقَبْرِ) يَتَبَكَّى عَلَيْهَا أَهْلُهَا فَضَالَ إِنَّهُمْ لَيَبْكُونَ عَلَيْهَا وَانْهَى لَتُعَذَّبَ فِي قَبْرِهَا (صحيح بخاری کتاب الجنائز باب قول النبي صلى الله عليه وسلم يعذب الميت ببعض بكاء أهله عليه جزء ۲ ص ۱۲۱ والنسائي کتاب الجنائز باب النياحة على الميت)

ملاحظہ فرمائیے کہ کس طرح مقصد بر آری کے لیے بخاری اور نسائی کی روایات کو ملا کر ایک روایت بنا ڈالی ہے۔ اگر صرف بخاری کی روایت پیش کرتے تو یہ صرف یہ کہ ان کا استدلال کا عدم ہو جاتا بلکہ ان کا ارضی قبر میں سوال و جواب اور عذاب کا موقف ہی باطل ثابت ہو جاتا کیونکہ اس میں قبر سے گزرنے کے الفاظ ہیں ہی نہیں ملاحظہ ہو:

۳۷۶۔ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ يُوسُفَ :

أَخْبَرَنَا مَا لِثْق عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ أَبِي بَكْرٍ
عَنْ أَبِيهِ عَنْ عُمَرَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ
أَنَّهُ أَخْبَرَهُ أَنَّهَا سَمِعَتْ عَائِشَةَ رَضِيَ
اللَّهُ عَنْهَا زَوْجَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
تَقُولُ : إِنَّمَا مَرَّرَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
وَسَلَّمَ عَلَى يَهُودِيَةٍ يَتَنَبَّأُ عَلَيْهَا أَهْلُهَا
فَقَالَ : إِنَّهُمْ لَيَسْجُدُونَ عَلَيْهَا وَإِنَّهَا
لَتُعَذَّبُ فِي قَبْرِهَا۔

ہم سے عبد اللہ بن یوسف نے بیان کیا کہ ہم کو امام
ماکئ نے خبر دی انہوں نے عبد اللہ بن ابی بکر بن محمد
بن عمرو ابن حزم سے انہوں نے اپنے باپ سے
انہوں نے عمرہ بنت عبد الرحمن سے انہوں نے حضرت عائشہ
رضی اللہ عنہا سے سنا جو نبی بنی نہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ و
آلہ وسلم کی انہوں نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک
یہودی عورت پر سے گزرے اس کے گھروالے اس پر رو رہے
تھے اور کہتے تھے کہ آپ نے فرمایا یہ قرابہاں رو رہے ہیں اور
وہاں اس کو قبر میں عذاب ہو رہا ہے۔

صحیح بخاری کتاب الجنائز

چنانچہ بخاری اور نسائی کی روایت کو ملا کر ایک روایت بنایا اور ترجمے میں (قبر) شامل کیا گیا تاکہ پڑھنے والا یہی سمجھے کہ ”نبی علیہ السلام قبر
سے گزرے“ بخاری کی روایت ہی کا حصہ ہے۔ جبکہ عربی متن میں (فی روايته النسائي يقرب) کے الفاظ کو شامل کیا یہ سمجھتے ہوئے کہ عربی
متن کو تو کم ہی لوگ دیکھتے ہیں۔ البتہ عربی متن کو غور سے پڑھنے والا تو سمجھ ہی لے گا کہ بخاری کی روایت میں نسائی کی روایت کے الفاظ کی
بیحد کاری کی گئی ہے۔ واضح رہے کہ یہ روایت مسلم اور دیگر کتب میں بھی موجود ہے لیکن بخاری و مسلم میں ”قبر سے گزرنے“ کے الفاظ
نہیں ہیں (اس کی مزید تفصیل انشاء اللہ آئندہ کسی شمارے میں پیش کی جائے گی)۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان کی جماعت کے وجود کا واحد سارا بخاری و مسلم کی یہ روایت ہے کہ ”جماعت المسلمین اور اس
کے امام سے وابستہ رہو“ اس کے بارے میں اہل حدیثوں نے جب ان کی توجہ دلائی کہ ابو داؤد اور مسند احمد کی روایات میں ”امام“ کے
بجائے ”خليفة“ کا ذکر ہے لہذا اس حکم کا تعلق تو خلافت اسلامیہ سے ہے یہ اس لئے نہیں کہ آپ کی طرح کوئی جماعت بنا کر خود ہی اس کا
امام بن جائے۔ موصوف نے اس کا جو جواب دیا ہے وہ ملاحظہ ہو:

جواب صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں :-

تَلَدَّ مَرَجَاعَةُ الْمُسْلِمِينَ وَإِمَامَهُمْ

تو اب یہ بتائیے کہ آپ نے مسند امام احمد کے حوالے سے جو الفاظ لکھے ہیں
وہ صحیح ہیں یا وہ الفاظ صحیح ہیں جو متفق علیہ روایت میں ہیں۔ رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم نے کون سے الفاظ فرمائے تھے۔ حدیث تو ایک ہی ہے تو
پھر الفاظ بھی ایک ہی ہونے چاہیے تھے۔ کیا جو حدیث ساتوں درجوں میں
سے کسی درجہ میں بھی صحیح نہ ہو اس کے ذریعہ آپ محض اپنے مطلب کی خاطر صحیح
کی حدیث کو مضطرب المثل بناد رہے ہیں۔

(عکس ”جماعتہ المسلمین“)

اپنے موقف کی حمایت و مدافعت کرتے ہوئے مزید فرماتے ہیں۔

”صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں لفظ ”امام“ ہے اور ابو داؤد میں لفظ خلیفہ ہے تو یہ بتائیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کون سا لفظ اپنی زبان اقدس سے ادا فرمایا تھا۔ یقیناً ”وہی لفظ ادا فرمایا ہو گا جس لفظ پر صحیح بخاری اور صحیح مسلم متفق ہیں“

(”الجماعۃ الخلفۃ“ ص ۱۹)

اب کوئی ان سے پوچھے کہ بخاری و مسلم کی روایت میں نساہی کی روایت کا پیوند لگا کر یا صحیحین کے مقابلے میں مسند احمد کی روایت لا کر آپ اپنے عقیدے اور موقف کا دفاع فرما رہے ہیں تو دوسری طرف اس طرح کی پیوند کاری کو نامناسب و ناجائز قرار دے رہے ہیں۔ جس طرح وہاں آپ کی دلیل ہے کہ ”حدیث تو ایک ہی ہے تو پھر الفاظ بھی ایک ہی ہونے چاہیے تھے اور الفاظ بھی وہی صحیح ہیں جو بخاری و مسلم کی متفق علیہ روایت کے ہیں۔“ گویا جو اصول آپ ایک جگہ استعمال کرتے ہیں پھر دوسری جگہ اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں اس کا کیا سبب ہے؟ کیا یہ ذہن پرستی اور مسلک پرستی نہیں؟۔ درج بالا اصول کے تحت تو آپ کو فراخی قلب کے ساتھ اس بات کو مان لینا چاہیے تھا کہ روایت کے وہی الفاظ صحیح ہیں جو بخاری و مسلم کی روایت میں ہیں یعنی ”نبی علیہ السلام یودیعہ کی میت پر سے گذرے“ (نہ کہ قبر سے کیونکہ یہ نساہی کی روایت کے الفاظ ہیں جو صحیحین کے مقابلے میں ناقابل ترجیح ہیں) اور پھر اسی لحاظ سے اپنے موقف کی اصلاح کر لینا چاہیے تھا کہ عذاب یودیعہ کے قبر میں دفن کرنے سے پہلے ہی شروع ہو گیا لہذا اس کا اس دنیاوی قبر سے کوئی تعلق نہیں!! لیکن نفس پرستی اور مسلک پرستی سے آلودہ ذہن ایمان و عقیدہ کی اصلاح کی طرف بہ مشکل ہی مائل و راغب ہوتا ہے وہ تو اکابرین کے اقوال و نظریات کے سانچے میں ڈھل کر تیار ہوتا ہے اور پھر حصول علم بھی دراصل انہی نظریات کے دفاع کے مقصد کے تحت ہوتا ہے۔

۱۲۔ ایک مشرکانہ نظریے کا دفاع: آج تقریباً تمام سالک اس عقیدے کے حامل اور اس کا پرچار کرنے میں سرگرم ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی دنیاوی قبر میں زندہ ہیں۔ بعض عالم تو قبر نبوی کے اندر سے اپنے سلام کا جواب سننے کے دعویدار ہیں تو کوئی علامہ صاحب فرماتے ہیں کہ نبی علیہ السلام نے قبر سے ہاتھ نکال کر قلاں صاحب سے مصافحہ بھی کیا تھا کسی نے بیان کیا کہ نبی علیہ السلام نے وفات کے بعد کسی سود خوار کے مسخ شدہ چہرہ پر ہاتھ پھیر کر اس کو ٹھیک کر دیا کسی بیمار خاتون کے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر اس کو شفاء دے دی کسی شیخ الحدیث نے اپنے والد صاحب کے مرض الموت میں ان کی عیادت بلکہ خدمت کے لیے نبی علیہ السلام کے تشریف لانے کا دعویٰ کیا (العیاذ باللہ!) الغرض ان کی کتابیں ایسی ہی گمراہ کن حکایات سے بھری ہوئی ہیں، عوام میں مقبول ہیں اور لوگوں کے عقیدہ کی بربادی کا ذریعہ بنی ہوئی ہیں۔ حالانکہ نبی علیہ السلام کی وفات پر امت کا پہلا اجتماع صحابہ کرامؓ میں اسی مسئلہ پر ہوا جبکہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قرآنی آیات کی تلاوت کر کے اس بات کو واضح کر دیا کہ نبی علیہ السلام کی وفات ہو گئی اور اللہ تعالیٰ آپ کو دو موتوں کا مزہ نہیں چکھائے گا (کہ بعد وفات کے پھر زندہ کرے اور پھر موت دے)۔ اس کی تفصیل کے لیے ڈاکٹر عثمانیؒ کے کتابچے ”وفات ختم الرسل“ کا مطالعہ کیا جائے۔ بعد کے دور میں کوئی ایسا واقعہ احادیث میں نہیں ملتا کہ کسی صحابیؓ نے قبر نبویؐ پر جا کر کسی مسئلہ پر ہدایت و رہنمائی طلب کی ہو یا کسی کو کبھی قبر نبویؐ سے سلام کا جواب دیا گیا ہو حالانکہ بلا شک و شبہ نبی علیہ السلام کو بعد والوں کے مقابلے میں اپنے صحابہؓ سے محبت و تعلق خاطر کہیں زیادہ تھا۔ دراصل وہ تو قرآن پر ایمان رکھنے والے اور اللہ سے ڈرنے والے تھے ان کے زمانے میں ایسے گمراہ کن مشرکانہ نظریات سے آلودہ جموں نے قصے و کہانیوں کو پھیلانے کا موقعہ کیسے مل سکتا تھا یہ تو اس وقت ہوا ہے جب کہ عقائد پر قبر پرستی کے صوفیانہ نظریات کی چھاپ لگی پھر مڑے زندہ ہوئے قبر سے باہر نکلنے لگے خوابوں میں آنے لگے اور یہ مشرکانہ عقائد سے آلودہ قصے جزو ایمان بن گئے! مسعود احمد صاحب بھی اس شرک آمیز توحید کے عقیدہ کے حامل ہیں۔ چنانچہ اس کی تائید اس طرح فرماتے ہیں ”ملاحظہ

عینی علیہ الصلوٰۃ والسلام اور حج

عینی علیہ الصلوٰۃ والسلام جب آسمان سے نازل ہوں گے تو حج رو حاتم مقام سے حج کا یا عمرہ یا دونوں کا احرام باندھیں گے۔

عینی علیہ الصلوٰۃ والسلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک پر آئیں گے اور سلام کریں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو جواب دیں گے۔

۱۔ حاکم کتاب الترمذی، سنہ صحیح - ۵۹۵ھ - (مصر: دار احیاء التراث العربیہ، ج ۱، ص ۲۳)

ایک طرف تو مصنف بار بار دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ کسی ضعیف روایت کو نیا نہیں بناتے تو دوسری طرف یہاں انہوں نے مستدرک حاکم کی جس روایت پر اعتماد کیا ہے اس کا ایک راوی ابو العیوب محمد بن احمد الحیری ہے جو حاکم کا استاد ہے، ذہبی اس کے بارے میں لکھتے ہیں "اسحاق بن شاپین سے اس نے روایت بیان کی ہے اور یہ کذاب ہے۔۔۔۔۔ اور اس سے روایت کرتے والے ابو احمد بن عدی اور حاکم ہیں اور کہا کہ میں نے محمد ثنین کو دیکھا ہے کہ وہ اس کو جھوٹا قرار دیتے تھے۔ ابن عدی کہتے ہیں کہ احادیث گھڑتا ہے اور میں نے ابو عروبہ کو کہتے ہوئے سنا کہ میں نے جھوٹوں میں اس سے زیادہ بے حیاء آدمی کوئی نہیں دیکھا۔" (میزان الاعتدال جلد ۳ ص ۵۸) (مصر: دار الفکر، ج ۱، ص ۲۳)

اس سند میں دو سرا جھوٹا راوی محمد بن اسحاق ہے جس کے دفاع کی کوشش مسعود صاحب نے اپنی تاریخ کے مقدمے میں کی ہے۔ محمد بن اسحاق مدلس بھی ہے اور یہ روایت اس نے "ثنین" کے لفظ سے بیان کی ہے (مدلس کی ایسی روایت ناقابل قبول ہوتی ہے)۔ اس کے بارے میں دار قطنی کہتے ہیں کہ یہ حجت نہیں، ثناتی کہتے ہیں کہ یہ قوی نہیں، ابو داؤد کہتے ہیں کہ یہ قدری بھی ہے اور معتزلی بھی۔ عبد الرحمن بن مہدی کہتے ہیں کہ یحییٰ ابن سعید انصاری اور مالک اس پر جرح کیا کرتے تھے۔ سلیمان بنی اور یحییٰ بن سعید القطان، وھب بن خالد اور حشام بن عروہ وغیرہ اسے کذاب اور جھوٹا قرار دیتے ہیں۔ ختم یہ ہے کہ کچھ لوگ ان کی تعریف بھی کرتے ہیں کیونکہ ان کے پاس تاریخ و سیرت کا کافی علم تھا، اسی وجہ سے ذہبی یہ لکھنے پر مجبور ہوئے کہ "مجھے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن اسحاق اچھے حال اور اچھی حدیث کا حامل "صدوق" راوی ہے (یاد رہے کہ "صدوق" توثیق کا کترین درجہ ہے) ہاں جس روایت کو بیان کرنے میں یہ منفرہ ہو وہ منکر ہوتی ہے کیونکہ اس کے حاشیے میں کچھ خرابی ہے۔" (میزان الاعتدال - جلد ۳ ص ۵۸) (۳۷۵ھ)

دوسری جگہ ذہبی سفیان بن حسین کے حالات میں لکھتے ہیں: "ابو حاتم کہتے ہیں صالح الحدیث ہے اس کی حدیث لکھ لی جائے لیکن دلیل نہ ملتی جیسے اس کا محمد بن اسحاق کا معاملہ ہے۔" (میزان جلد ۳ ص ۱۶۵)

پھر ایک اور جگہ کہتے ہیں: "جمہور محدثین کے نزدیک محمد بن اسحاق اور حجاج بن ابی طالب کی روایت سے حجت نہیں لی جاتی۔" (میزان جلد ۳ ص ۱۶۶)۔ دوسری جگہ ذہبی نے ان کی اس طرح تضعیف کی ہے "محمد بن اسحاق اور حجاج بن ابی طالب متروک تو نہیں لیکن ان کا ضعیف ہونا ظاہر ہے۔" (میزان الاعتدال - جلد ۳ ص ۱۶۶)

اب آخر میں یہ ذکر بھی کرتے چلیں کہ مکرمہ خارجیوں کی رائے رکھتے تھے جب مدینہ کے متولی نے انہیں بلایا تو وہ داؤد بن الحصین کے گھر چھپ گئے اور وہیں وفات پائی۔ ذہبی کہتے ہیں:

"میں کہتا ہوں کہ اسی وجہ سے داؤد مکرمہ سے بہت سی ایسی منفرہ روایتیں بیان کرتا ہے جن کو غریب قرار دیا جاتا ہے اور بہت سے حفاظ (محدثین) ان منفرہ روایات کو منکر شمار کرتے ہیں، خاص طور پر جب وہ ان کو بیان کرنے والا بالکل اکیلا راوی ہو، جس طرح محمد بن اسحاق اور دوسرے اسی قسم کے راوی ہیں۔" (میزان الاعتدال - جلد ۵ ص ۳۳)

اس تفصیلی بحث سے ان راویوں اور ان کی بیان کردہ حاکم کی اس روایت کی حیثیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، جس کی بنیاد پر نبی علیہ السلام کی قبر سے سلام کا جواب دینے کا قصہ بیان کر کے موصوف نے اپنے آپ کو عقیدہ کے لحاظ سے بریلوی اور دیوبندیوں کے گروہ میں شامل کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں قرآن و صحیح احادیث پر غور و فکر کی توفیق سے نوازے، اور قرآن و صحیح احادیث کی بنیاد پر ہی ایمان و عقیدہ کو استوار کرنے کی ہمت عطا فرمائے، آمین۔

۱۳۔ پرویز ثانی کے روپ میں: مسعود احمد صاحب نے اپنی کتابوں میں کئی جگہ ڈاکٹر عثمانی پر ترجمے میں خیانت کا الزام لگایا ہے۔ یہاں ڈاکٹر عثمانی کا دفاع مقصود نہیں، ان کتابچوں کا بغور پڑھنے والا خود ہی ایسے الزامات کی بے بضاعتی اور بودے پن کا اندازہ کر سکتا ہے۔ البتہ یہاں صرف یہ نشاندہی کرنا ہے کہ خود مسعود احمد صاحب نے ترجمے کے سلسلہ میں جو کارنامہ انجام دیا ہے تو دیکھنا یہ ہے کہ اس کے بعد وہ خود اپنے بارے میں کیا رائے قائم کرتے ہیں!۔ گذشتہ صفحات میں بھی ان ترجموں کے چند نامور نمونے پیش کئے جا چکے ہیں، اب فی الوقت طوالت سے بچنے کے لیے ان میں سے صرف دو مزید مثالیں بطور ”مثبتے از خوارے“ پیش کرنے پر ہی اکتفا کریں گے (ورنہ تو ایک کتاب تیار ہو جائے گی خاص طور سے ان کا کتابچہ ”عصمت رسول“ تو خیانتوں کا شاہکار ہے) جس سے آپ کو بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ قرآن و حدیث کی تاویل میں اب یہ غلام احمد پرویز ثانی کا ہی مقام حاصل کئے ہوئے ہیں!۔ اپنے پیش رو کی اتباع کرتے ہوئے اب ان کی کوشش بھی یہ ہے کہ لغت سے تلاش کر کے الفاظ کے ایسے معنی برآمد کئے جائیں جو قرآن و حدیث کا مفہوم اپنے عقیدے اور موقف کے مطابق پیش کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوں۔ چنانچہ ”عصمت رسول“ کے تحت منعقد کئے جانے والے اپنے ایک جلسے میں انہوں نے جو تقریر کی تھی وہ اب ایک پمفلٹ کی شکل میں شائع کی گئی ہے۔ اس میں سورۃ الفتح کی ابتدائی آیات کا جو ترجمہ لغت سے ہیرا پیمبری کرتے ہوئے برآمد کیا وہ جس اپنی مثال آپ ہی ہے۔ ملاحظہ ہو:

اس تفصیل و ضمانت کے بسباب آیت کا صحیح ترجمہ ملاحظہ فرمائیے:-

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

وَلَا تَحْزَنْكَ ذَلِكَ، لَشَاءَ مَهِينًا، وَتَجِدُ	(اللہ رسول) ہم نے آپ کو فتح میں ہی ہانک دیا
ذَلِكَ، اللَّهُ مَا تَشَاءُ مَرِينَ، قُلْ لَكَ وَنَا	آپ پر گناہ گئے، اچھے پچھلے تمام الزامات کی
تَاخَّرَ وَبُيِّنَ لِقَمَّتَهُ عَلَمَاتُ وَتَجِدُ	اصلاح فرمائے اور آپ پر اپنی نعمت پوری
هَذَا مَا كُنْتُمْ يَفْتَنُونَ، وَيَنْصُرَكَ اللَّهُ	کدے اور آپ کو سیدھے راستہ پر پہلانا
تُصْطَرِّعُونَ، يَا	مہرے۔ (بدشگ) اللہ آپ کی (ہر موقع پر)
	ذہر دست مد کرے گا۔

(جلس ”عصمت رسول“ ص ۷)

پڑھئے اور موصوف کی جولانی طبع کی داد دیجئے! کس طرح سیدھی سادھی عبادت کو توڑ مروڑ کے عجوبہ روزگار معنی و مفہوم پہناتے کی کوشش فرمائی ہے!۔ ”ذنب“ کے معنی ”لغزش“ کو تباہی، گناہ یا خطا کے ہیں، (دلچسپ بات یہ ہے کہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کے لیے انہوں نے لغزش کے الفاظ اسی کتابچے میں استعمال کیے ہیں) سین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کا احترام و تقدس ملحوظ رکھتے ہوئے ”ذنب“ کے ترجمے میں لغزش یا کو تباہی کا لفظ استعمال کرنے سے مفہوم بخوبی اواہو جاتا ہے، چنانچہ آیت کا ترجمہ اس طرح ہوتا ہے:

”بے شک ہم نے آپ کو کھلی فتح دی تاکہ اللہ آپ کی اگلی اور پچھلی لغزشیں معاف فرمائے اور آپ پر اپنی نعمت پوری کرے۔۔۔۔۔“

اس کے برخلاف مسعود احمد صاحب نے ”لیغفر لکد۔۔۔ وما تاخرو“ کا جو عجیب و غریب اور بے تکا ترجمہ کیا ہے اس کا تو کوئی قرینہ ہی نہیں بنتا، تاکہ اللہ آپ پر لگائے گئے اسلئے اور پچھلے الزامات کی اصلاح فرمائے! اس کے صحیح ثابت کرنے کے لیے ”ایک خاص تاریخی پس منظر“ کا ذکر کرنا محض بے پر کی اڑانے والی بات ہے۔ اس سلسلے میں کچھ احادیث پیش کی جاتی ہیں جو ان کی معنوی تحریف اور علمی فریب

کاری کا پردہ چاک کرنے کیلئے کافی ہو گئی۔

۱۹۳۔ حدثنا الحسن بن عبد العزيز حدثنا عبد الله بن يحيى حيوة عن ابيه الاسود سمع عروة عن عائشة رضي الله عنه ان نبي الله صلى الله عليه وسلم كان يقوم من الليل حتى تتفطر قدماء قالت عائشة لم تصبح هذا يا رسول الله وقد غفر الله لك ما تقدم من ذنبك وما تأخر؟ قال الا احب ان اكون عبدا شكورا؟ فلما كثر لعمه صلى جالسا فاذا رنان يركع قام فقرأ ثم ركب. انا اول سنانك ساعدا ومبشرا ونظيرا

حسن بن عبد العزيز، عبد اللہ بن یحییٰ حیوۃ ابو الاسود، عروہ، حضرت عائشہ روایت کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ

وسلم رات کو اس قدر کھڑے ہوتے کہ آپ کے پاؤں پھٹ جاتے تھے۔ عائشہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ اس قدر تکلیف اٹھاتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے اگلے پچھلے گناہ بخش دیئے ہیں؟ آپ نے فرمایا کیا مجھے پسند نہیں کہ میں شکر گزار بندہ بنوں، پھر جب آپ کے جسم میں گوشت زیادہ ہو گیا، تو آپ بیٹھ کر نماز پڑھتے۔ اور جب رکوع کا ارادہ کرتے۔ تو کھڑے ہو کر کچھ قرات کرتے پھر رکوع کرتے (آیت بیشک ہم نے آپ کو شاہد مبشر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ بخاری میں فی تفسیر سورۃ الفتح)

غور فرمائیے! یہاں ام المومنینؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرتی ہیں کہ ”آپ اتنی تکلیف کیوں اٹھاتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے تو آپ کی اگلی پچھلی لغزشیں معاف فرمادی ہیں۔“ لیکن مسعود صاحب کے ترجمہ کے لحاظ سے مفہوم شاید یہ ہو گا کہ ”آپ پر لگے ہوئے اگلے پچھلے الزامات کی اصلاح تو ہو چکی۔“ یعنی بھلا اب آپ کو کون سے الزامات کا خطرہ ہے جو آپ اتنی عبادت کر رہے ہیں!! (دوسری حدیث ملاحظہ ہو:)

۱۹۔ حدثنا محمد بن سلام قال انا عبدة عن هشام عن عائشة قالت كان رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا امرهم من الاعمال بما يطيقون قالوا انا لنسأله حتى يفرحنا ان الله قد غفر لك ما تقدم من ذنبك وما تأخر ليفضب حتى يعرف الغضب لي وجهه ثم يقول ان اتاكم واعلم بالله

۱۹۔ ہم سے محمد بن سلام نے بیان کیا وہ کہتے ہیں کہ انہیں عہدہ نے خردی، وہ ہشام سے نقل کرتے ہیں۔ ہشام عائشہؓ سے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو کسی کام کا حکم دیتے تو وہ ایسا ہی کام ہوتا جس کے کرنے کی لوگوں میں طاقت ہوتی (اس پر) صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہم لوگ تو آپ جیسے نہیں ہیں۔ (آپ تو معصوم ہیں) مگر ہم سے گناہ سرزد ہوتے ہیں اس لیے ہمیں اپنے سے زیادہ عبادت کرنے کا حکم فرمائیے اور آپ کی تو اللہ تعالیٰ نے اگلی پچھلی سب لغزشیں معاف فرمادیں۔ (یہ سن کر) آپ ناراض ہوئے حتیٰ کہ خفگی آپ کے چہرہ مبارک سے ظاہر ہونے لگی۔ پھر فرمایا کہ بیشک میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں اور تم سب سے زیادہ اسے جانتا ہوں۔ (مسلم صحیح بخاری۔ کتاب الایمان)

موصوف کے لحاظ سے ”ذنب“ کے معنی الزام لینے سے صحابہ کرامؓ کے استفسار کا انداز یہ ہو گا ”اے نبی! ہماری آپ سے کیا نسبت“ آپ پر لگے ہوئے سارے الزامات کی اصلاح ہو چکی لیکن ہمارے اوپر تو الزامات ابھی باقی ہیں۔۔۔۔۔!!“ ”چہ خوب!“ (امیہ زبانی)

اللہ تعالیٰ ایسی انفرادیت، خود بینی اور ذہن پرستی کے روگ سے محفوظ رکھے! امین! اسی طرح امام بخاری کتاب التفسیر سورۃ البقرۃ کی آیت ”وعلم ادم الاسماء کلها“ کے باب میں واقعہ شفاعت لائے ہیں۔ نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ لوگ سفارش کیلئے انبیاء علیہم السلام کی خدمات میں سفارش کیلئے حاضر ہوتے ہیں اور ہر ایک اپنی کوئی تقصیر یاد کر کے نذر خواہی کے ساتھ ان کو بعد والے نبیؐ کے پاس بھیج دیتا

واقف ہے روائے دواں

اللہ
حَمْدُ

شکیل الرحمن و خالد محمود بخاری

بلوچستان میں دعوت الی اللہ

صوبہ بلوچستان میں اس سے قبل دعوت و تبلیغ کا کام یہاں کے مرکز 'ہستی کوڑی' میں اجتماعات 'بارکھان' کے ایک دو مقامات پر بھی کبھار درس قرآن کے علاوہ انفرادی رابطوں اور محدود پیمانے پر لڑچکر کی تقسیم تک محدود رہا۔ البتہ اکتوبر ۱۹۹۹ء میں امیر عظیم کے دورے کے موقع پر کوڑی میں ہونے والے اجتماع کے دوران لورالائی شہر میں دعوت الی اللہ کا ایک پروگرام ہوا جس میں دو مقامات پر تقریر کے علاوہ تقریباً "پورے شہر میں دعوتی لڑچکر بھی تقسیم کیا گیا تھا۔

گزشتہ سال بلوچستان کے ساتھیوں کی پر زور تجویز پر یہ طے ہوا کہ پنجاب اور کراچی سے کچھ ساتھی مقامی ساتھیوں سے مل کر بلوچستان کے مختلف مقامات پر دعوت الی اللہ دیں گے جس کے دوران دعوتی لڑچکر کو عام تقسیم کیا جائے گا۔ چنانچہ اس پروگرام میں امیر عظیم کے ساتھ پنجاب کے امیر حکیم محمد رمضان صاحب اور کراچی سے مرکزی شوری کے ارکان محمدی گل صاحب اور محمد افضل خان صاحب نے بھی شرکت کی۔

بلوچستان میں دعوت الی اللہ کے اس پروگرام میں شرکت کے لیے کراچی اور پنجاب کے مختلف حلقوں سے آنے والے ساتھی ۸ ستمبر کو مسجد توحید ڈیرہ غازی خاں پہنچ گئے۔ چونکہ دعوت الی اللہ کے پروگرام سے پہلے ۸ ستمبر بروز جمعہ کو مسجد توحید ہستی کوڑی میں ایک روزہ اجتماع کا پروگرام رکھا گیا تھا۔ اس طرح ڈیرہ غازی خاں میں بھی ہلکے پھلکے اجتماع کی صورت حال پیدا ہو گئی۔ چنانچہ موقع کی مناسبت سے صلوٰۃ العصر کے بعد کراچی کے محمدی گل صاحب نے سورۃ البقرۃ کے ابتدائی رکوع کی آیات کے حوالے سے خطاب کیا اور حاضرین کے سامنے ایمان، اہل ایمان کی خصوصیات، اتفاق اور منافقین کی نشانیوں کو تفصیلی طور پر واضح کیا۔ صلوٰۃ العشاء کے بعد امیر عظیم نے ساتھیوں کے سوالوں کے جواب دیے۔ مسجد توحید ڈیرہ غازی خاں میں قیام شب کے بعد ۸ ستمبر کو صلوٰۃ الفجر کے بعد رکنی جانے والی دیگنوں کے ذریعے بلوچستان روانگی ہوئی اور ڈیرہ غازی خاں کے عقب میں کبہ سلیمان کے پہاڑی سلسلے کو عبور کرتے ہوئے تقریباً "دس بجے رکنی سے ذرا آگے واقع ہستی کوڑی پہنچے۔ جہاں تھوڑی دیر آرام کے بعد ساتھیوں نے صلوٰۃ الجمعہ کے لیے تیاری کی۔ صلوٰۃ الجمعہ سے قبل کراچی کے ساتھی منور سلطان صاحب نے سورۃ الفرقان کی آیات ۲۷ تا ۲۹ کے حوالے سے خطاب کیا اور حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی کتاب (قرآن مجید) کی دعوت اور منافقین کی طرف سے اس دعوت حق کے خلاف اٹھائے جانے والے اعتراضات کے بودے پن کو واضح کیا۔ صلوٰۃ الجمعہ کے بعد امیر عظیم نے مختصر خطاب کے بعد سوالوں کے جواب دیے۔ صلوٰۃ العصر کے بعد محمدی گل صاحب نے سورۃ البقرۃ کے آخری رکوع کی آیات کے حوالے سے تقریر کی اور سورۃ میں مذکور نبی اسرائیل کی نافرمانیوں پر مشتمل سرگزشت کا اسمالی جائزہ لیتے ہوئے

ایمان و اعمال کی اصلاح اور بالخصوص صبح و عشاء کے سلسلے میں اخلاص کی اہمیت کو واضح کیا۔ انہوں نے حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے بیان کیا کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کی رات اللہ کی طرف سے تین تجھے عطا کئے گئے۔ صلوٰۃ پہنچانہ سورۃ البقرۃ کی یہ آخری دو آیات اور آپ کی امت میں شرک نہ کرنے والے کی مغفرت کی خوشخبری۔ لیکن افسوس کہ آج ان بیش بہا قدر و منزلت کے حامل تحفوں کی کھلی ناقدری ہو رہی ہے۔ آج قرآن کی آیات اور صلوٰۃ کو فروخت کیا جا رہا ہے، شرک سے اجتناب کے بجائے اس کو رواج دیا جا رہا ہے اور اس سارے کھیل کی سرپرستی اس قوم کے اہل بار و رحبان کر رہے ہیں۔ صلوٰۃ المغرب کے بعد یا ہی تعارف کی نشست ہوئی اور اس کے بعد امیر تنظیم نے سوالوں کے جواب دیے۔

۹۔ متبر کو صلوٰۃ الفجر کے بعد امیر تنظیم نے سورۃ البقرۃ کی آیت **وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُوْنُوا شٰهَدًا عَلٰی النَّاسِ.....** کے حوالے سے ساتھیوں کے سامنے دعوت و تبلیغ کی ذمہ داری اور اس کی اہمیت بیان کرتے ہوئے انہیں دوران سفر مختلف مقامات پر دعوت الی اللہ سے متعلق ہدایات دیں اور بتایا کہ بلوچستان میں اس طرح کے پروگرام کا یہ پہلا موقع ہے، اس لیے ساتھی اس لحاظ سے بھی اس اہم ترین ذمہ داری کے تعلق سے پوری سنجیدگی، اخلاص اور نظم و ضبط کا خاص طور سے خیال رکھیں۔ دعوت کے میدان میں خود اپنی تربیت کا بہترین موقع ہوتا ہے۔ اس لیے اس موقع سے بھرپور استفادے کی کوشش کریں۔ بعد ازاں اشراق و ناشتے سے فارغ ہو کر آٹھ بجے تقریباً ڈیڑھ سو افراد پر مشتمل یہ قافلہ امیر تنظیم کی سرپرستی میں چھ ویگنوں اور تین ڈائن پک اپ گاڑیوں کے ذریعہ لورالائی کی طرف روانہ ہوا۔ دن کے پونے دو بجے لورالائی شہر میں پہنچے۔ کراچی کے شرافت اللہ صاحب نے شہر کے مرکزی مقام پر سورۃ المؤمن کی آیت **تَوَقَّلْ بِالْحِکْمِ اَدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ.....** کے حوالے سے دعوت الی اللہ کی تقریر کی اور کافی تعداد میں شہر کے اندر دعوتی لڑیچہ تقسیم کیا گیا۔ اس کے بعد شہر سے باہر ایک باغ میں قیام کیا گیا جس کے دوران ساتھیوں نے یا ہی تعاون سے کھانے کا انتظام کیا، پھر طعام اور صلوٰۃ الفجر و عصر (دوران سفر) سے فارغ ہو کر ساڑھے چار بجے یہ قافلہ قلعہ سیف اللہ کے لیے روانہ ہوا۔

لورالائی سے روانگی کے بعد شام کے پونے چھ بجے قلعہ سیف اللہ پہنچے۔ قلعہ سیف اللہ ایک چھوٹا سا شہر ہے جو بختون آبادی پر مشتمل ہے۔ چنانچہ یہاں محمدی گل صاحب نے سورۃ البقرۃ کے تیسرے رکوع کی ابتدائی آیات پر مشتمل پشتو زبان میں دعوت الی اللہ کی تقریر کی اور لوگوں کے سامنے ہر طرح کے شرک سے اجتناب کرتے ہوئے اللہ بندگی کی دعوت پیش کی، جس کو لوگوں کی بڑی تعداد نے پوری توجہ کے ساتھ سنا۔ اختتام پر کچھ افراد نے قدرے ناراضگی کے ساتھ سوال بھی کئے تاہم ان کو اچھے انداز سے سمجھا دیا گیا۔ دعوت الی اللہ کے ساتھ ساتھ یہاں پورے شہر میں دعوتی لڑیچہ بھی تقسیم کیا گیا۔ قلعہ سیف اللہ میں دعوت الی اللہ سے فارغ ہونے کی بعد تقریباً پونے سات بجے مسلم باغ کی طرف روانگی ہوئی اور سوا آٹھ بجے رات کو مسلم باغ پہنچے۔ مسلم باغ بھی قلعہ سیف اللہ کی طرح چھوٹا سا شہر ہے جو بختون آبادی پر مشتمل ہے۔ یہاں کراچی کے شرافت اللہ صاحب نے پشتو میں دعوت الی اللہ پیش کی اور ساتھ ہی شہر کے اندر موجود لوگوں میں دعوتی لڑیچہ بھی تقسیم کیا گیا۔ مسلم باغ سے روانہ ہونے کے بعد کپلاک سے پہلے مرغٹان کے مقام پر ایک مسجد میں صلوٰۃ المغرب و عشاء ادا کی گئی اور پھر طعام کے بعد وہیں قیام شب رہا۔

۱۰۔ متبر کو صلوٰۃ الفجر اور ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر مرغٹان سے کونڈ کے لیے روانہ ہوئے اور ۸ بجے کونڈ شہر پہنچے۔ جہاں بلدیہ شاہنگ پلازہ کے سامنے محمدی گل صاحب نے کونڈ شہر کے لوگوں کے سامنے پشتو میں دعوت الی اللہ پیش کی جس کو لوگوں کی بڑی تعداد نے سنا۔ انہوں نے سورۃ الذاریات کی آیت **تَوَمَّا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اَلِیَعْبُدُوْنَ** کے حوالے سے لوگوں کے سامنے ان کی زندگی کے مقصد کو واضح کیا کہ وہ اللہ کی بندگی کریں اور اس کے ساتھ کسی انداز میں بھی کسی کو شریک نہ کریں۔ وہ اللہ جو سب کو کھلانے پلانے والا اور قوت متین کا مالک ہے۔

اس کے بعد ساتھی و دعوتی لڑیچہ تقسیم کرتے ہوئے زیارت چوک پہنچے جہاں واہ کینٹ (راولپنڈی) کے محمد اعظم خان نے سورۃ البقرہ کی آیت نمبر ۴ کے حوالے سے دعوت الی اللہ پیش کی۔ بعد ازاں سول ہسپتال کے نزدیک دو مقامات پر کیمپین (ر) ارشد صاحب اور کراچی کے محمد افضل خان صاحب نے سورۃ الروم اور آل عمران کی آیات کے حوالے سے لوگوں کے سامنے دعوتی تقاریر کیں اور ان کے سامنے قرآن و حدیث کے حوالوں سے واضح کیا کہ شرک اللہ کے عذاب کو دعوت دینے والی چیز ہے جبکہ دنیا و آخرت کی کامیابی کا دار اس بات پر ہے کہ انسان دنیا میں خالص اللہ کی بندگی اختیار کرے اور اس طرح آخرت میں اسے جہنم کی آگ سے بچا کر جنت کی بادشاہی میں داخل کر دیا جائے۔ کوئٹہ شہر میں چار مقامات پر دعوتی تقاریر کے علاوہ کافی تعداد میں دعوتی لڑیچہ تقسیم کیا گیا جس کے بعد تقریباً ”سوا گیارہ بجے کھلاک کی طرف روانگی ہوئی۔ کھلاک کوئٹہ سے (والہی سڑک) نزدیک ایک چھوٹا سا شہر اور منڈی ہے جو بختون آبادی پر مشتمل ہے۔ چنانچہ یہاں پر دعوتی لڑیچہ کی تقسیم کے علاوہ ایک مقام پر شرافت اللہ صاحب نے سورۃ الاعراف کی آیت: قُلْ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا، الخ پر مشتمل پشتو زبان میں دعوت الی اللہ پیش کی، پھر واپس مرغٹان کی طرف روانگی ہوئی جہاں کچھ ساتھی کھانے کا انتظام کرنے کے لیے ٹھہر گئے تھے۔ مرغٹان میں کھانا کھانے کے بعد زیارت کے لیے روانگی ہوئی۔ تقریباً ”چار بجے زیارت شہر میں پہنچ کر سب سے پہلے صلوٰۃ الفجر و عصر ادا کی گئی۔ صلوٰۃ سے فارغ ہونے کے بعد شہر کے درمیان محمدی گل صاحب نے سورۃ الاخلاص کے حوالے سے پشتو میں دعوت الی اللہ پیش کی کیونکہ زیارت بھی بختون آبادی پر مشتمل ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ دعوت الی اللہ کی تقریر کو شرکی تقریباً ”ساری آبادی نے بڑی توجہ اور دلچسپی سے سنا اور بڑے شوق سے دعوتی لڑیچہ وصول کیا۔ زیارت کے بعد سنبھوی کے مقام پر بھی دعوت الی اللہ کا پروگرام تھا لیکن راستہ خراب اور دشوار گزار ہونے کے باعث مقررہ وقت سے بہت دیر بعد رات کو وہاں پہنچے جس کی وجہ سے سنبھوی میں دعوت الی اللہ نہ ہو سکی۔ چنانچہ اس کے بعد پوری رات مسلسل (سوائے مختصر قیام نزو اور لالائی برائے طعام اور صلوٰۃ المغرب و عشاء) سڑک کے کنارے تھوڑی دیر قبل رکنی کے قریب پہنچے۔ یہاں صلوٰۃ الفجر ادا کی گئی، بعد میں امیر تنظیم نے مختصر درس قرآن و حدیث دیا پھر چائے، کاشے سے فارغ ہو کر قریب ہی واقع رکنی شہر (جو ضلع بارکھان کا صدر مقام بھی ہے) پہنچے۔ رکنی میں محمد اعظم خان اور امیر تنظیم نے کچے بعد دیگرے لوگوں کے سامنے دعوت الی اللہ پیش کی جس کے بعد شہر میں دعوتی لڑیچہ تقسیم کیا گیا۔ اس طرح رکنی شہر میں دعوت الی اللہ کا آخری پروگرام اختتام پذیر ہوا۔ جس کے بعد باہر سے آنے والے مقامی ساتھیوں سے الوداع ہو کر اپنے اپنے علاقوں کی طرف روانہ ہو گئے۔

حلقہ طلباء و نوجوانان کا آٹھواں سالانہ تربیتی اجتماع

حسب معمول ناظمین کے سالانہ تربیتی اجتماع سے قبل طلباء کا سالانہ تربیتی اجتماع ۸ اکتوبر ۹۵ء کو مسجد توحید (ڈیرہ جدید) سرگودھا میں منعقد ہوا۔ جس کی مختصر رواد و رج ذیل ہے:

صلوٰۃ الفجر کے بعد طلباء و نوجوانوں کے مرکزی ناظم خالد محمود بخاری نے سورۃ المدھر کی ابتدائی آیات پر مشتمل درس قرآن دیا۔ اجتماع کا باقاعدہ آغاز کیمپین (ر) ارشد کے افتتاحی کلمات سے ہوا۔ انہوں نے سورۃ آل عمران کی آیات ۱۶۲ تا ۱۶۳ کے حوالے سے طلباء کے سامنے دینی ذمہ داریوں کو واضح کیا، ان ذمہ داریوں سے عمدہ برآ ہونے کے لیے ایسے اجتماعات میں شرکت کی افانیت اور ان سے بھرپور استفادے کے لیے نظم و ضبط کی ضرورت پر زور دیا۔ ارشد صاحب کے ابتدائی کلمات کے بعد کتابچہ ”یہ مزار اور میلے“ کے مقررہ حصے سے تحریری امتحان ہوا اور اسی دوران بچوں کے درمیان دعوت الی اللہ کی تقاریر کا مقابلہ ہوا۔ تحریری امتحان میں کراچی کے طالب علم ساتھی عبدالروف نے ۸۶ نمبر لے کر اول پوزیشن جبکہ کیروالہ کے محمد شبیر نے ۸۳ اور ناظم آباد کراچی کے محمد اشتیاق نے ۸۲ نمبر لے کر دوسری اور تیسری پوزیشن حاصل کی۔ بچوں کے درمیان دعوت الی اللہ کی تقاریر میں منوڑہ کراچی کے شاہد امین نے اول پوزیشن حاصل کی۔

وقفے کے بعد صحاح ستہ کے حوالے سے کتاب المبارک سے فصل 'وضو'، 'استنجاء'، 'تیمم'، 'مسح' اور 'مسواک' وغیرہ سے متعلق مسائل پر مشتمل معلوماتی پروگرام ہوا جس میں نوجوان ساتھیوں نے بڑی دلچسپی اور ذوق و شوق سے حصہ لیا اور اس طرح اس پروگرام کے ذریعہ ان مسائل سے متعلق ایک ایک چیز کو سامعین کے سامنے لانے کی کوشش کی گئی۔ اس پروگرام کو بہت پسند کیا گیا کہ ان معلومات کا ہماری روزمرہ زندگی سے مستقل تعلق ہے۔

کھانے اور صلوٰۃ النفر کے وقفے کے بعد سورۃ الحشر کی آیات ۸ تا ۱۰ پر مشتمل فہم القرآن کا پروگرام ہوا۔ مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے نوجوان ساتھیوں نے مناسب تیاری کے ساتھ اس پروگرام میں حصہ لیا اور موضوع سے انصاف کرتے ہوئے اپنے حاصل مطالعہ کو اچھے انداز میں پیش کیا۔ تاہم پروگرام میں حصہ لینے والے مقررین میں محمد آصف (منٹوڑہ کراچی)، محمد شبیر (کبیر والہ) اور صالح محمد (ڈیرہ قدییم۔ سرگودھا) بالترتیب پہلی، دوسری اور تیسری پوزیشن۔ لے کر نمایاں رہے۔

فہم القرآن کے بعد نوجوان ساتھیوں کے درمیان اسپڈ کونز (اسلامی معلومات) کا پروگرام ہوا۔ جس کے تین مرحلے تھے۔ پہلے مرحلے سے بارہ ساتھی سوالات کے ذریعے دوسرے مرحلے میں پچھپے جہاں ان سے چار چار سوال کئے گئے اور اس طرح تین ساتھی تیسرے اور آخری مرحلے میں داخل ہوئے۔ یہاں ان میں سے ہر ایک سے دس دس سوالات کئے گئے اس طرح خالد محمود بخاری (لاہور) ۱۰ میں ۸ سوالات کے صحیح جواب ۳۰.۹۵ سیکنڈ میں دے کر اول، مجاہد حسین (سرگودھا) ۳۳.۰۲ سیکنڈ میں ۷ سوالات کے صحیح جواب دے کر دوم اور محمد اکرم (گوجرانوالہ) ایک منٹ میں ۳ سوالات کے صحیح جواب دے کر سوم رہے۔ صلوٰۃ العصر کے بعد خالد محمود بخاری کے اختتامی کلمات پر طلباء و نوجوانوں کا یہ تربیتی اجتماع اختتام پذیر ہوا جس کے بعد امیر تنظیم نے مختلف پروگراموں میں نمایاں پوزیشن حاصل کرنے والے نوجوان ساتھیوں اور بچوں کی حوصلہ افزائی کے لیے ان میں انعامات تقسیم کئے۔

کل پاکستان تربیتی اجتماع برائے ناظمین

حسب سابق اسد فہم بھی یہ سالانہ تربیتی اجتماع (۹ تا ۱۱ اکتوبر ۹۵ء) مسجد توحید (ڈیرہ قدییم۔ سرگودھا) میں ہی منعقد ہوا۔ بلکہ آئندہ سال بھی اس کو یہیں رکھنے کا فیصلہ کرا لیا گیا۔ جس میں موثر کردار یہاں کے میزبان 'انتہائی شفیق اور بزرگ ساتھی محترم اللہ یار کلیار صاحب مرحوم کا تھا' جن کا اصرار تھا کہ اس اجتماع کی جگہ میں تبدیلی کسی اہم ترویجی ضرورت کے علاوہ نہ کی جائے۔ چنانچہ امیر تنظیم نے اس اجتماع کیلئے جگہ کی وسعت اور مناسب سہولت کے ساتھ ساتھ بزرگ اور شفیق میزبان کی محبت اور وسعت قلبی پر مبنی پیش کش کو قبول کرتے ہوئے ان کو تجویز کے مطابق فیصلہ کر دیا۔ اللہ یار کلیار صاحب مرحوم کی تنظیم کے ساتھ مخلصانہ وابستگی، اللہ کے دین کیلئے جذبہ و تڑپ اور مومن ساتھیوں کیلئے محبت ایثار کا معاملہ اپنی مثال آپ تھا۔ اب وہ ہمارے درمیان موجود نہیں (ان کی وفات گزشتہ رمضان کے اوائل میں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے!) لیکن ان کی محبت اور شفقت ایک عرصے تک ساتھیوں کو ان کی یاد دلاتی رہے گی۔ اتنے بڑے اجتماع کے انتظامات کے سلسلے میں اخراجات کی فراہمی کے ساتھ ساتھ بھرپور ذاتی توجہ و دلچسپی اور اس پر مستزاد تنظیم کیلئے اضافی مالی ایثار ان کے اتفاق فی سبیل اللہ کی تابناک مثال ہے۔ اس کے علاوہ اللہ کی راہ میں نکلنے کیلئے اللہ کے بندے کے ذوق و شوق کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وفات سے ذرا قبل 'باوجود اس کے کہ سماعت و بصارت سے تقریباً محروم ہو چکے تھے' گجرات شہر میں پنجاب سٹاپ پر ہونے والے دعوت الی اللہ کے پروگرام میں شرکت کیلئے سرگودھا سے گجرات کا سفر کیا اور پھر شہر بھر میں دعوت الی اللہ کے پروگرام کے دوران لائٹھی لیکر ساتھیوں کے ساتھ چلتے رہے۔ اس قدر معذوری اور پیرانہ سالی کے باوجود اللہ کی راہ میں یہ ذوق و شوق اور جواں بہتی آخرت کی تیاری کیلئے فکر مندی کا پتہ دیتی ہے۔ ایسے ہی یکسو اور ثابت قدم جو انہم اس اخروی بشارت کا مصداق ہیں یا تہا النفس المطمئنہ ۰

اوجہی الی دیکھ واضحہ مروضیہ ○ فادخلی فی عبادی ○ وادخلی جنتی ○ (الفرقان: ۲۰-۲۱)

اللہ تعالیٰ اپنی بارگاہ عظیم میں شرف قبولیت کے ساتھ بھرپور اجر و ثواب سے نوازے۔ یہ اور مرحوم کی ان خدمات اور اپنی راہ میں ایثار و قربانی کو ان کے لئے آخرت کا توشہ بنادے۔ (آمین)

۹ اکتوبر بعد صلوٰۃ الفجر پنجاب کے امیر حکیم محمد رمضان صاحب نے سورۃ الانعام کے آخری رکوع کی آیات قل انمی هللی فی صراط مستقیم..... واللفظ ورحیم ○ پر مشتمل درس قرآن دیا اور اللہ کی کتاب کے مختلف حوالوں سے انبیاء عظیم السلام کی دعوت کو مجموعی طور واضح کیا۔ اشراق و دانش سے فارغ ہونے کے بعد اجتماع کا باقاعدہ آغاز محمد اعظم خان کے افتتاحی کلمات سے ہوا۔ انہوں نے سورۃ التوبہ کی آیت والمؤمنون والمؤمنات بعضهم اولیاء بعض..... ان اللہ عزیز حکیم ○ کے حوالے سے شرکاء اجتماع کے سامنے اہل ایمان کی انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریوں اور اس اشتراک عمل کی وجہ سے ان کے درمیان تعلق کی اہمیت کو واضح کیا۔ اور اس تربیتی اجتماع کے تعلق سے احساس ذمہ داری اور نظم و ضبط کی طرف توجہ دلائی تاکہ وہ اس طرح کے مواقع سے بھرپور استفادہ کر کے اپنی اصل ذمہ داریوں سے اچھی طرح عمدہ برآمد ہونے کے قابل ہو سکیں اور اللہ کی راہ میں باہمی تعاون سے یہ اجتماعی کاوش فروغ پائے۔

اس کے بعد کراچی کے نوجوان ساتھی خالد عزیز نے حرفِ حق کے قاری اور ان کی صحیح ادائیگی کے ساتھ تجوید کے بنیادی اصول وضاحت سے بیان کئے اور ساتھیوں کو ان کی روشنی میں قرات القرآن کی مشق بھی کرائی۔

بعد ازاں قسم القرآن کے سلسلے میں سورۃ الاعراف کی آیت ولله الاسماء الحسنی فادعوه بها..... کے حوالے سے ۲۰ منٹ کے دورانیے کی چھ تقاریر ہوئیں جس میں مختلف علاقوں کے ساتھیوں نے حصہ لیا۔ حج صاحبان کے تہرے کے مطابق تقاریر کا معیار مجموعی طور پر بہتر تھا۔ ان کے فیصلے کے مطابق زاہد حیات (نوبٹنگل سرحد) نے پہلی، سلمان عبداللہ (کراچی) نے دوسری اور سعید بن بشیر (شکوہ پورہ) نے تیسری پوزیشن حاصل کی۔

صلوٰۃ ظہر کے بعد عربی تعلیم کا پروگرام ہوا جس میں سرگودھا کے ناظم ماسٹر عبدالعزیز صاحب نے معظم عربی حصہ اول کے اسباق کا اعادہ کرایا۔ صلوٰۃ العصر کے بعد باہمی تعارف کی نشست ہوئی جس میں ملک کے مختلف حصوں سے آنے والے ساتھیوں نے اپنا اپنا تعارف پیش کیا۔ صلوٰۃ المغرب کے بعد صوبہ سرحد کے امیر عمر خطاب صاحب نے سورۃ النور کی آیت انما کان قول المؤمنین اذا دعوا الی اللہ ورسولہ..... الخ کے حوالے سے سمع و طاعت کے موضوع پر تقریر کی اور شرکاء اجتماع کے سامنے کتاب و سنت کے حوالوں سے اللہ کے دین کے لئے قائم کی گئی اجتماعیت کے اندر سمع و طاعت کی ضرورت اور اہمیت کو واضح کیا۔ صلوٰۃ العشاء کے بعد امیر تنظیم نے حاضرین کے سوالوں کے جواب دیئے۔

۱۰ اکتوبر کو صلوٰۃ الفجر کے بعد ماسٹر عبدالعزیز صاحب نے سورۃ الاحزاب کی آیات لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنہ..... وما یملکوا تبہلاً ○ پر مشتمل درس قرآن دیا اور اسوۃ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کے تعلق سے بیان کیا کہ جس طرح قرآن بنی نوع انسان کے لئے ہدایت کی کتاب ہے لیکن اس سے ہدایت صرف مستقیم ہی حاصل کر سکتے ہیں یعنی وہ لوگ جو اللہ کی نافرمانی سے بچنا چاہتے ہیں جن کے دل میں اللہ کے ہاں پیشی اور احتساب کا خوف ہوتا ہے۔ اسی طرح اسوۃ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل پیرا ہونے کیلئے یہ معیار رکھا گیا ہے کہ اللہ کے رسول کی زندگی میں بہترین نمونہ ان لوگوں کیلئے ہے جو اللہ پر یقین رکھنے والے اس کے احسانات پر اس کا ذکر اور شکر کرنے والے اور جن کے دل میں اللہ سے ملاقات یعنی آخرت کے دن کا یقین ہو۔

اشراق و دانش کے وقفے کے بعد عربی تعلیم کا پروگرام ہوا جس میں ماسٹر عبدالعزیز صاحب نے معظم عربی حصہ دوم کے اسباق پر مشتمل تعلیم دی۔ اس کے بعد رفع صحنی و مسند سحر کے عنوانات پر مشتمل تحریری امتحان ہوا جس میں زیادہ تر نوجوان ساتھیوں نے حصہ لیا۔ نتائج کے مطابق منور سلطان (کراچی) اور خالد محمود بخاری (الابھور) 68 نمبر لے کر اول، فہیم اختر (جام پور) 66 نمبر لے کر دوم اور سجاد حسین

(سرگودھا) 65 نمبر لیکر سوم رہے۔

تقریر کی امتحان کے بعد فقہ انکار حدیث کے عنوان پر دو تقاریر ہوئیں۔ پہلے کراچی کے معید احمد صاحب نے سورۃ آل عمران کی آیات قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی... لا یحب الکافرین کے حوالے سے اپنی تقریر کا آغاز کیا اور متعدد قرآنی آیات کے حوالے سے اجماع رسول کی حیثیت و اہمیت کو واضح کرتے ہوئے بیان کیا کہ جس چیز کی اہمیت کو قرآن اس شد و مد کے ساتھ بیان کرتا ہے اس کی اہمیت کو گھٹانا یا اس کا انکار دراصل قرآن کا انکار ہے۔ اس طرح یہ فقہ انکار حدیث نہیں بلکہ فقہ انکار قرآن ہے کیونکہ منکرین حدیث کا موقف قرآنی تعلیمات سے متصادم ہی نہیں ان کے برعکس بھی ہے۔

اس کے بعد کراچی کے یعقوب علی صاحب نے رفع یمینی علیہ السلام کے موضوع پر تقریر کی۔ انہوں نے سورۃ النساء کی آیات و قولہم انا قتلنا المسیح عیسیٰ ابن مریم..... و یوم النیمة یكون علیہم شہداء کے حوالے سے اپنی گفتگو کا آغاز کیا اور بتایا کہ آج دو گروہ رفع و نزول یمینی علیہ السلام کے منکر ہیں۔ ایک قادیانی جن کے سرپرست غلام احمد قادیانی کو اس کے ذریعے اپنی جھوٹی نبوت کیلئے راستہ ہموار کرنا تھا۔ اور اسی لیے اس نے مسیح موعود اور مثل مسیح ہونے کا دعویٰ کیا۔ جبکہ دوسرا گروہ منکرین حدیث کا ہے جس کے سرغنہ غلام احمد پرویز نے اس کو اپنے مقصد یعنی انکار قرآن و حدیث کیلئے استعمال کیا۔ یہ دونوں گروہ مسیح علیہ السلام کی موت کے دعویٰ ار ہیں بالکل اسی طرح ان سے پہلے دو گروہ (یسود و نصاریٰ) یمینی علیہ السلام کے قتل اور سولی چڑھانے کے دعویٰ ار تھے۔ قرآن نرقان ہے۔ صدیوں کے معاملات کا فیصلہ کرنے والی کتاب ہے۔ جس طرح اس نے قدیم و عویداروں کے بارے میں فیصلہ دیا کہ قتل و سولی کے دعویٰ ار دونوں جھوٹے ہیں۔ اور یہی نہیں بلکہ ان کے تمام جرائم کی داستان کھول کر رکھ دی۔ اسی طرح کذاب و سنت کی تعلیمات ان کے جانشینوں یعنی جدید و عویداروں کا رو فرماتی ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے قرآن و حدیث کے متعدد حوالوں سے ان کے کذب و فریب کا پردہ چاک کیا۔

صلوۃ النہر کے وقفے کے بعد پاکستان شوریٰ کی میٹنگ ہوئی اور اسی دوران دعوت الی اللہ کی تقاریر کا پروگرام ہوا۔ جس میں چندہ منٹ دورانے کی پانچ تقاریر کی گئیں۔ ان تقاریر میں کارکردگی کے اعتبار سے عبدالرؤف بن محمد افسرخان مرحوم (کراچی) اول، صالح محمد (سرگودھا) دوم اور عبد اللہ عمر (سرحد) سوم رہے۔

صلوۃ العصر کے بعد اصول حدیث کے سلسلے میں علم الحدیث کی اہمیت اور بنیادی اصطلاحات پر مشتمل تقیمی پروگرام ہوا جس میں کراچی کے یعقوب علی صاحب نے مدرس کے فرائض انجام دیئے۔

صلوۃ العشاء کے بعد خانیوال کے ناظم ماسٹر سرفراز صاحب نے سورۃ الجادلہ کی آیت لا تعجلو ما یوسون باللہ..... ہم المفلحون کے حوالے سے پنجابی میں تقریر کی۔ اور تفصیل سے بیان کیا کہ اہل ایمان کے ایمان کی کیفیت اور معیار کی پرکھ اور آزمائش اس بات میں ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے مقابلے میں دنیا کے کسی رشتے اور تعلق، محبت و عقیدت، فائدے اور نقصان کی کوئی پروا نہ کریں۔ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ مخالفت رکھنے والوں کی ساتھ ان کی دوستی نہ ہو۔ انہوں نے اس سلسلے میں قرآن و حدیث کے متعدد حوالوں سے ایمان کے اس معیار اور اس سلسلے میں کتاب و سنت کے احکامات بیان کئے جن میں اہل ایمان کو اس معیار پر پورا اترنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ جسکا پاسداری پر رب کائنات کی طرف سے ان کے ایمان کی صداقت دنیا و آخرت کی کامیابی، بہشت کی لازوال نعمتوں اور ان سے بڑھ کر اس کی رضا و خوشنودی کے حصول کی خوشخبری سنائی گئی ہے۔

11 اکتوبر کو صلوۃ الفجر کے بعد محمدی گل صاحب نے سورۃ البقرہ کی آیات و من الناس من یقول امنا..... بما کانوا یکنون پر مشتمل درس قرآن دیا اور قرآن و حدیث کے متعدد حوالوں سے منافقانہ کردار کی تفصیل سے وضاحت کی۔ اشراق و ناشتے کے وقفے کے بعد راولپنڈی کے خلیل الرحمن صاحب نے شرکاء کو تجوید کے اصول سکھائے اور ان کے مطابق قرات القرآن کی مشق کرائی۔ اس کے بعد صوبائی امراء نے اپنے اپنے علاقوں کے اندر دعوتی سرگرمیوں اور تعلیم و تربیت کے پروگراموں کی تفصیل بیان کی۔ اور اس سلسلے میں پیش آنے والی مشکلات اور کام کی رفتار کو بہتر بنانے کیلئے تجاویز پیش کیں۔

(باقی صفحہ ۱۲ پر ملاحظہ فرمائیے)

سلسلہ سوال و جواب

ڈاکٹر مسعود الدین عثمانی رحمۃ اللہ علیہ (ترتیب سے) محمد اشرف عاصم و سر فرراز احمد

سوال نمبر 1 = اگر مرنے والے کے ایصالِ ثواب کے لیے قرآن خوانی کی جائے تو اس میں کیا حرج ہے؟

جواب = گویا اس میں کہنا یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خیر کا کام نہیں کیا جبکہ نبی کی بیوی صدیقہ کی وفات ہوئی ہے، حدیث کے بیٹے فوت ہوئے تو کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس خیر کے کام سے محروم چلے گئے۔ کہتے ہیں اس میں حرج کیا ہے؟ اچھا کام ہی تو ہے! تو کیا اذان دینا اچھا کام نہیں؟ اقامت کہنا اچھا کام نہیں؟ عید اور بقرہ عید کی نماز سے پہلے اذان دو! اقامت کو! کہیں گے نہیں صاحب یہ تو بدعت ہے! تو آخر بدعت کی تعریف کیا ہے؟ یہی تو ہے کہ جو خیر کا کام اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کر سکتے تھے اور آپ نے نہیں کیا، اس کا نہ کرنا سنت ہے اور جو کیا ہے اس کا کرنا سنت ہے۔ تو جس طرح سنت اختیار ہے اسی طرح سنت ترک ہے! باقی بیٹ کی بات اور ہے، کاروبار اور دھندے کا معاملہ اور ہے۔ بچے کی ولادت ہو تو خالی مولوی صاحب اس کے کان میں اذان دیں گے، پانچ دس روپیہ اس کو ملنا چاہیے۔ پھر زندگی بھر شادی بیاہ ہے، حج، بم اللہ ہے کل سہرا بندھے گا، وفات پا گئے اسکات (صدقہ خیرات) ہو رہا ہے۔ چاہے کوئی شخص مفلس ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے وارثوں کو محروم کر کے خود مال کھاؤ پھر حلوہ ہے، شوا (سوئم) ہے، پھر ہر شعرات کو چالیسواں اور بری ہے پھر اگر یہ مر گیا تو کیا ہوا اس کے بال بچے تو زندہ ہیں، یہ بھی تو مریں گے۔ ان کی پیدائش سے لے کر موت تک بلکہ جب تک میں زندہ ہوں ان سے کھانا رہوں گا! یہ کاروبار ہے چلتا ہوا کاروبار۔ جس طرح ایک چشمہ رواں ہوتا ہے، ہمیشہ رواں رہتا ہے! یہ ان مولویوں کا کھانا ہے، یہ کھائیں گے، ان کو کوئی روک نہیں سکتا! ان کی بادشاہی ہے۔ باقی ایصالِ ثواب کا عقیدہ قرآن کا خالص کفر ہے۔ ایک دو نہیں سیکڑوں آیات ہیں قرآن میں کہ انسان اپنے ہی کیے کا صلہ پائے گا۔ دوسری بات قرآن پڑھنے (قرآن خوانی) سے یہ مقصد ہو کہ سمجھنے اور عمل کرنے کے لیے تو یہ ایسا لازم چیز ہے کہ جس کا اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو براہ راست حکم دیا گیا ہے اور یہ سنت نبوی ہے۔ لیکن اگر قرآن خوانی سے یہ مطلب ہو کہ لوگوں کو نوح کر کے انہیں پارے بانٹ دیں، جائیں کہ اتنا پڑھو گے اور اتنا تم، تو یہ ایک کھیل اور ڈھونگ بنایا ہے لوگوں نے اپنی غرض کے لیے۔ کبھی انیکشن کا زمانہ ہوتا ہے تو لوگوں کو جمع کرتے ہیں، کبھی کاروبار کے افتتاح کے موقع پر تو کبھی باپ مرجائے تو دکھاتے ہیں کہ ہم بڑے دین دار ہیں، یہ خالص بدعت اور گمراہی ہے۔

سوال نمبر 2 = کیا یہ صحیح ہے کہ قیامت کے دن حافظ قرآن کے والدین کو تاج پہنایا جائے گا؟

جواب = بالکل صحیح ہے اور یہ ان کا ذکر ہے جو بچے مومن ہوں، اپنے بچوں کے خیر خواہ ہوں، اپنے بچوں کو مومن اور حافظ قرآن بنائیں، قرآن کا علم حاصل کرنے والا بنائیں، ان کا بڑا درجہ اور اجر ہے۔ چاہے حافظ نہ بھی بنائیں، قرآن کا علم سکھائیں، عمل کرنے والا بنائیں، بڑا اجر ہے ان کے لیے۔ اسی لیے مسلم کی حدیث میں آیا کہ تین چیزوں کا ثواب مرنے کے بعد بھی ملتا رہتا ہے، کوئی علمی کام کیا ہو، اپنی اولاد کو صالح بنایا ہو، کوئی بھلائی کا کام کیا ہو۔ بچے جو عمل بھی کریں گے جتنا ثواب بچوں کو ملتا ہے اتنا ہی والدین کو ملے گا اور یہ بہت بڑی بات ہے کہ اپنے بچوں کو حافظ قرآن بنایا جائے۔ ایسے حافظ پر اللہ کا عذاب ہو گا جو قرآن کو سمجھ کر نہ پڑھے اور اس کے خلاف اس کا عقیدہ و عمل ہو۔

سوال نمبر 3 = ننگے سر نماز پڑھنا کیسا ہے؟ بعض ساتھی اسے صحیح سمجھتے ہیں۔

جواب = میرا یہ چیلنج ہے کہ کوئی مجھے ایک حدیث لا کر دکھادے کہ ننگے سر نماز ادا کی گئی ہو! احرام کی حالت کے علاوہ جب اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سر کا بند نہ کرنا لازم قرار دیا۔ لیکن اس کے علاوہ حدیث میں کوئی تصدیق نہیں ہوتی کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا ان کے اہل علم صحابہؓ نے ننگے سر نماز پڑھی ہو۔ یہاں تک کہ بخاری یہ بھی لائے ہیں کہ اگر نماز میں ٹوپی گر جائے تو وہ سر پر رکھنے اور صحیح کر لینے سے بھی نماز خراب نہیں ہوتی۔ اور کہیں یہ نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بغیر عمامے کے یا قلنسوہ (لمبی ٹوپی) کے یا کالے کپڑے کی پٹی سے سر کو بند کیے بغیر نماز پڑھی ہو۔ سورۃ الاعراف میں ہے:

خُذُوا زِينَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ..... مومنو! جب نماز پڑھو تو اپنی زینت اختیار کر لو۔

اور مومن کی زینت سنت کے عین مطابق سر بند ہونا چاہیے۔ ٹوپی ہو یا عمامہ ہو، عمامہ زیادہ بہتر ہے، کوئی حدیث موجود نہیں کہ آپؐ نے اس کے علاوہ نماز پڑھی ہو اور جو لوگ جابرؓ کی روایت لاتے ہیں کہ انہوں نے بغیر عمامے کے نماز پڑھی، یہ زیادتی ہے کیونکہ بخاری روایت لائے ہیں کہ جابرؓ ٹائینا تھے وہ نماز پڑھا رہے تھے اور ایک چادر باندھ لی تھی۔ اس کا طریقہ یہ بتاتے ہیں کہ گردن سے لٹکا دی۔ جب ان کے شاگردوں نے شکایت کی کہ استاد آپؐ کی چادر ننگی ہوئی ہے اور آپؐ نے دوسری چادر موجود ہوتے ہوئے ایک چادر میں نماز پڑھائی ہے تو انہوں نے کہا کہ ایسا میں نے جان بوجھ کر کیا ہے تاکہ کوئی سوال کرے اور میں یہ بتا دوں کہ میں نے آپؐ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ دو چادروں کی موجودگی میں آپؐ نے ایک چادر میں نماز پڑھی ہے۔ جو از کے لیے کہ ایک چادر بھی ہو، اسے گردن سے باندھ کر لٹکالے اور اپنا ستر بند کر لے تو بھی نماز جائز ہے۔ یہ چادر یا ردا کا ذکر ہے لوگ اس پر کہتے ہیں کہ جابرؓ نے بغیر عمامے کے نماز پڑھائی۔ حالانکہ سر کے لیے یا تو عمامہ ہوتا ہے یا قلنسوہ ہوتا ہے۔ ردا نہیں ہوتی۔

سوال نمبر 4 = اگر مومن بھائی اپنی کسی تقریب میں یا جلسہ میں بلاتا ہے اور اس میں فتنہ گرانی ہوتی ہے تو کیا ہم اس میں شرکت کر سکتے ہیں؟

جواب = اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دعوت جو دی جاتی ہے تو جہاں ایک بھائی کے دوسرے بھائی پر بہت سے حقوق ہیں وہاں ایک حق یہ بھی ہے کہ ایک مومن بھائی دعوت دے تو اسے قبول کیا جائے۔ ایک طرف یہ بات ہے دوسری طرف معاملہ یہ ہے کہ مومن آدمی کسی ایسے کام میں شرکت نہیں کر سکتا کہ جس میں اللہ کی نافرمانی ہو رہی ہو اور یہ فتنہ گرانی ایسی چیز ہے جسے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شدت سے ناپسند کیا ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ جو ایمان کے اقرار کی تصویر کشی کی لعنت میں مبتلا ہو جاتے ہیں انہیں شدید عذاب ہوگا۔ ایمان والوں کو اس سے بہت زیادہ بچنا چاہیے، لیکن اگر پھر بھی یہ ہو تو ان سے یہی کہہ دینا چاہیے کہ بھائی! اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے دعوت قبول کرنے کا۔ لیکن اگر اس میں یہ باتیں نہ ہوں جو آپؐ گناہی کر رہے ہیں تب تو یہ بڑے ثواب کا کام ہے اور اس میں شرکت ہمارے لیے بھی خوشی کی بات ہوتی۔ لیکن ان باتوں کی وجہ سے ہم آپؐ سے معذرت خواہ ہیں۔ ہمارا اور آپؐ کا ایمانی رشتہ اپنی جگہ پر، مگر اللہ کی نافرمانی سے ہم آپؐ کو بھی روکتے ہیں اور خود بھی اللہ سے پناہ مانگتے ہیں کہ ہم سے مروت میں کوئی ایسی بات ہو جو ہمارے مالک کو ناراض کر دے۔

سوال نمبر 5 = مونچھیں منڈوانا کیسا ہے؟

جواب = احادیث میں جو چیز آتی ہے وہ بخاری مسلم میں ابو موسیٰ اشعریؓ سے ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مونچھیں پست کرو اور واژمی کو بڑھاؤ۔ اب بعض لوگوں نے مونڈنا مراد لیا ہے لیکن امام مالک کی بات فیصلہ کن معلوم ہوتی ہے کہ مونڈنا نہیں چاہیے جیسا کہ تاریخ میں آتا ہے کہ عمرؓ جب تنظر کے عالم میں ہوتے تھے تو اپنی مونچھوں کو دانتوں میں دبالیٹے تھے۔ اب اگر مونچھیں مونڈ دی جائیں تو دانتوں کے درمیان دبالیٹنے کا کوئی موقع نہیں۔ اس لیے امام مالک کہتے ہیں کہ جو مونچھوں کو مونڈتے ہیں وہ مثلاً کرتے ہیں یعنی اللہ کی دی ہوئی شکل اور ہیئت کو بدلتے ہیں۔ قرآن میں آتا ہے کہ شیطان نے کہا تھا کہ میں تیرے بندوں کو اس طرح سے راہ دکھاؤں گا کہ وہ صورتوں

کو جو چھری تخلیق کی ہوئی چیز ہے بدل دیں گے۔ تو امام مالک کہتے ہیں کہ یہ مثلہ ہے اور شیطانی عمل ہے۔ اور مسلم کی ایک روایت مغیرہ بن شعبہ سے آئی ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں کھانے پر ممان تھے، جب وہ پہنچے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ مغیرہ تمہاری مونچھیں لب سے آگے ہیں۔ پھر آپ نے ایک مسواک اور چھری منگوائی اور مسواک رکھ کر چھری سے جو بال آگے آگئے تھے انہیں کاٹ دیا۔ اس زمانے میں یہی انداز ہونا ہوگا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مونچھیں مونڈ دینا صحیح نہیں۔

سوال نمبر 6 = اگر قرآن ہاتھ سے گر جائے تو اس کا کیا کفارہ ہے؟ قرآن وحدیث کے مطابق جواب دیں۔

جواب = قرآن وحدیث کے اندر اس قسم کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی، اس کا کوئی کفارہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں بتایا۔ لیکن یہ جو ہمارا کاروباری ہے اس نے دیکھا کہ آخر کسی سے بھول ہوئی ہے، پیچھتاوا بھی ہے کہ احتیاط سے اٹھایا ہوتا تو جب اس کی پیدائش سے لے کر موت تک اس کی رگوں سے یہ خون کھینچتا ہے تو ہر ہر خطا پر کھینچنے کے لیے اس نے یہ اپنے من گھڑت کفارے رکھے ہیں۔ اس کے کفارے کا فتویٰ کوئی مضائقہ کے ذریعے اور کوئی جیسوں کے ذریعے سے دیتا ہے اور اس کا اکثر حصہ فتویٰ دینے والے کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اگر جان بوجھ کر گرایا ہے تو اللہ سے بہت زیادہ استغفار کرنا چاہیے، اللہ بخشنے والا ہے اور اگر بلا ارادہ کر گیا ہے تو گناہ نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ اگر دل کی تسلی کے لیے کچھ اللہ کے نام پر دے دو تو اچھا ہے۔ یہ فتوے ہیں ان کے، جب کوئی گناہ نہیں تو دل کی تسلی کیسی؟ بالکل بھڑکا فتویٰ ہے، کچھ نہیں دیتا ہے مولوی کو۔

سوال نمبر 7 = بقرعید پر قربانی کرنے کے بجائے اگر کسی غریب کی مدد کر دی جائے تو کیا قربانی کا ثواب مل جائے گا؟

جواب = میرے خیال میں اگر کوئی نماز کے وقت نماز نہ پڑھے، مٹیوں پر کام کرتا رہے کہ سامان بن رہا ہے، لوگ فائدہ اٹھائیں گے، انسانیت کی خدمت ہوگی اور نماز کا ثواب بھی اسی انسانیت کی خدمت سے مل جائے گا! تو اگر یہ ہے کہ دنیا کے لیے اللہ کے سارے احکام کو ختم کرنا ہے تو بس پھر وقت بچاؤ، پیسہ کماؤ، رہو، خزانے کے سانپ بن جاؤ اور پھر آکھو بند ہو تو بزرخ جہنم بن جائے اور جہنم کی آگ میں اتر جاؤ! آخر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ قربانی کی ہے، تنگ دستی نہ، پاؤں جو آج یہ بڑے بڑے مولوی بیان کرتے ہیں، اخباروں کے مضامین میں آتا ہے کہ فلاں آدمی حج پر نہیں گیا اور روپیہ کسی غریب کو دے دیا تو اس کا حج بھی قبول ہو گیا۔ پھر لوگوں نے اسے وہاں حج کرتے ہوئے بھی دیکھا اور یہ اعلان ہو گیا کہ اس کی وجہ سے سب کے حج قبول ہو گئے۔ خالص جھوٹی باتیں ہیں۔

ضروری وضاحت

جبل اللہ کے مجلہ نمبر ۱۶ میں صفحہ ۴۵ پر اعادۂ روح کے نیچے دی گئی عبارت میں تسلسل نہ ہونے کی وجہ سے بعض قارئین کو یہ اشتباہ ہوا ہے کہ دوسرے پیرے کی عبارت رصحیح احادیث سے ثابت ہے۔۔۔۔۔ مشہور ہے، ڈاکٹر عثمانی مرحوم کی ہے۔ حالانکہ یہ پوری عبارت عنوان سمیت "الدین الخالص" پہلی قسط صفحہ ۱۲ کی ہے۔ جیسا کہ عبارت کے اختتام پر اس کا حوالہ دیا گیا ہے۔ (قارئین نوٹ فرمائیں۔ شکریہ!)

اتحادی دین کی ایجاد کے بعد اس کے دباؤ کا یہ حال رہا ہے کہ گذشتہ صدیوں

میں بہت کم ایسے علم والے ملیں گے جو پوری طرح قرآنی توحید کی ترجمانی کر پائے ہوں۔ رابہ بڑھتی ہوئی ایک بھی ایسا عالم نہیں گذرا ہے جو اس اتحادی فلسفہ سے متاثر نہ رہا ہو۔ اس لیے اس ملک میں جو گروہ کم سے کم عقیدہ کے فساد میں مبتلا ہے اس میں بھی اتحادی فلسفہ کی وجہ سے دو صریح خرابیاں موجود ہیں، ہر چند کہ اس گروہ نے دوسری ساری شریک ٹھہرائی جانے والی ہستیوں سے تو پہچان چھڑا لیا مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہی عقیدہ رکھا کہ وہ وفات کے بعد بھی قبر میں زندہ ہیں اور اگر کوئی وہاں پہنچ کر درود و سلام پڑھے تو سُننے میں اور اس کے لیے انہوں نے اُس جھوٹی اور موضوع (گھڑی ہوئی) روایت کو دلیل بنایا ہے جس میں محمد بن مردان ہندی صغیر صاحب الکلبی موجود ہے اور جس کو سارے محدثین نے کذاب اور ضاع کہا ہے۔ اور امام حقیل نے اس روایت کو بیان کرنے کے بعد لکھا ہے کہ "لا اصل له"۔

اور دوسرا فاسد عقیدہ اس گروہ کا یہ ہے کہ کچھ خاص ملائکہ اس کام کے لیے مقرر ہیں کہ لوگوں کے پڑھے ہوئے درود و سلام کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک براہ راست پہنچائیں۔ ان کے اس عقیدہ کی دلیل وہ روایت ہے جس کا اصل راوی "زاذان" رافضی ہے اور جس نے اپنے اس فاسد عقیدہ کو کہ رافضی مومنین کے اعمال اُن کے بارہ آئمہ معصومین کے حضور پیش کئے جاتے ہیں، اس روایت کے ذریعہ اسلام میں داخل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح سے دو فاسد عقیدے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کی صفات کا حامل قرار دیتے ہیں اس ملک کے سب سے بہتر عقیدہ رکھنے والے گروہ میں بھی موجود ہیں۔ پہلا عقیدہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو "الحی" قرار دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ آپ کو موت نہیں آئی اور اس طرح قرآن اور حدیث کی اُن ساری نصوص کی نفی کرتا ہے جن میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ آپ کے لیے بھی موت ہے اور وفات پا جانے کے بعد کس کیلئے سُننا ممکن نہیں ہے اور یہ بات کہ وَمِنْ ذَرَائِهِمْ بَرَزَخٌ اِلٰی یَوْمٍ یَّبْعَثُوْنَ (اور مرنے والوں اور اس دنیا کے درمیان ایک آڑ ہے قیامت کے دن تک) (المومن) اور موت آجانے کے بعد قیامت کے دن ہی پھر زندہ ہو کر اٹھنا ہوگا شَرَا تَکُوْیَوْمَ الْقِیَامَةِ یُبْعَثُوْنَ (المومن) (یعنی مرنے کے بعد) پھر تم لوگ قیامت ہی کے دن دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے جاؤ گے (المومن) رہا دوسرا عرض اعمال درود و سلام کا عقیدہ تو یہ بعض اعمال میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذات الہی ہے اشتراک اور ذات الہی کی تجزوی معطل کی غمازی کرتے ہوئے لَیْسَ کَمِثْلِهِ شَیْءٌ کا انکاری ہے۔



مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءَ سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ
وَأَبَاؤُكُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ (يونس)
”اِس (اللہ) کو چھوڑ کر جن جن کی تم بندگی کرتے ہو وہ تو بس چند نام ہیں جو تم نے
اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں اللہ نے انکی کوئی سند نازل نہیں کی۔“

غوثُ الاعظم

(سب سے بڑا فریاد رس)

”کون ہے جو بے قرار کی دعا سنتا ہے جب اُسے پکارتا ہے
اور (کون) اس کی تکلیف رفع کرتا ہے اور (کون) تم کو زمین پر
(پچھلے لوگوں کا) جانشین بناتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی
اور اللہ بھی ہے؟ (ہرگز نہیں)۔“

(النمل - ۶۲)

مُشکلُ کُشا

(مشکلات ختم کرنے والا)

”اور اگر اللہ تمہیں کسی تکلیف میں مبتلا کر دے تو اُس کے علاوہ
کوئی مشکل دور کرنے والا نہیں اور اگر وہ تمہیں کسی غیر سے نوازنا
چاہے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

(الانعام - ۱۷)

گنجِ بخش

(خزانے بخشنے والا)

”اور آسمانوں اور زمین کے خزانے
اللہ ہی کے لئے ہیں۔“

(المنافقون - ۷)

غریب نواز

(غریبوں کو نوازنے والا)

”اے لوگو! تم سب کے سب اللہ کے در
کے فقیر ہو اور اللہ تو معنی و حمید ہے۔“

(زاملہ - ۱۵)

دستگیر

(مصیبت کے وقت تھامنے والا)

”اور (حال یہ ہے کہ) جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو لیٹے،
بیٹھے اور کھڑے (ہر حالت میں) ہمیں پکارتا ہے، پھر جب ہم اس کی
تکلیف کو دور کر دیتے ہیں تو اس طرح (بے پرواہ ہو کر) گزر جاتا ہے
جیسے اس نے اپنی تکلیف میں کبھی ہمیں پکارا ہی نہ تھا۔“

(یونس - ۱۲)

داتا

(دینے والا)

”بے شک اللہ بڑا دینے والا ہے۔ (سورۃ آل عمران - ۸)

”(اللہ) جسے چاہتا ہے بیٹیاں عطا کرتا ہے، جسے چاہتا
ہے بیٹے دیتا ہے، جسے چاہتا ہے بیٹے اور بیٹیاں دونوں عطا
فرماتا ہے اور جسے چاہتا ہے بے اولاد رکھتا ہے۔ وہ تو جاننے
والا (اور) قدرت والا ہے۔“ (الشوریٰ - ۴۹، ۵۰)

يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ ﴿۱﴾ اے انسان! تجھے رب کریم کے معاملے میں کس چیز نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے؟